رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

رجب ۱۳۷۰ھ

جلد ۳۶ عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ ۔ لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	رجب ۱۳۷۵ھ - مطابق مارچ ۱۹۵۶ء	جلد ۴۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

نیا دستور تیسری خواندگی کے مرحلے سے گذر کر ملک کے حاکم اعلیٰ کی منظوری حاصل کر چکا ہے اور ۲۳ مارچ سے نافذ ہو جانے والا ہے۔ یہ دستور نقائص کے متعدد تشویشناک پہلو اپنے اندر رکھنے کے باوجود اس معنی میں اسلامی دستور ہے کہ اس نے تعمیر و ارتقاء کا رُخ اسلام کی طرف پھیر دیا ہے۔ لیکن اس رُخ پر عملاً تعمیر و ارتقاء کا کام جبھی ہوگا کہ کرنے والے اسے کریں، ورنہ مجرد دستور کے الفاظ میدان میں آکر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔ کام کرنے والے اگر دستور کے اصول و مقاصد کے مطابق کام کرنے کی نیت رکھتے ہوں تو بڑا سوال یہ سامنے آئے گا کہ سب سے پہلے کدھر سے کیا تبدیلیاں شروع کی جانی چاہئیں۔ ہم اسی سوال کو سامنے رکھ کر چند بڑی بڑی ضرورتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ کسی اصولی نقشے پر ریاست اور معاشرہ کی عمارت استوار کرنا ہو تو اولین ضرورت یہ ہوتی ہے کہ عوام کے ذہن و فکر کو بدلا جائے۔ جوں جوں ذہن و فکر کی ساخت ٹھیک ہوتی جاتی ہے، زندگی کے ہر شعبے میں تعمیری و اصلاحی کام سرانجام پانے لگتا ہے۔ قوم کے ذہن و فکر کو بنانے میں سب سے بڑا عامل نظامِ تعلیم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کسی نوع کے تعمیری کام کا آغاز کرنے کے لیے پہلی توجہ نظامِ تعلیم کی طرف ہوتی ہے۔

اب تک ہمارا نظامِ تعلیم ایک بے سر و پا اور مجہول نقشے پر چل رہا ہے۔ وہ کوئی نصب العین نہیں دیتا کوئی نظریہ یا اصول نہیں دیتا، کوئی ٹھوس کردار نہیں دیتا اور اس کے ذریعے ہم اسلامی نظامِ زندگی کے لیے تو کجا کسی بھی آغاز اور ترقی طلب معاشرے کے لیے رہنما اور کارکن حاصل نہیں کر سکتے۔ پس یہ نظامِ تعلیم اگر اپنی اسی مجہول حالت پر قائم رہے تو ہم نئے دستور کے تقاضے کسی درجے میں بھی پورے کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ اسے بدلنے کے لیے پہلے بھی عام بے چینی موجود تھی مگر اب نئے دستور کے سامنے آجانے کے بعد تو اسے موجودہ

صورت میں گوارا کرنا کھلی کھلی حماقت ہوگا۔

اب ہمارے کارپردازوں کو کسی تاخیر کے بغیر اس نظامِ تعلیم کے سامنے نئے دستور کا یہ مطالبہ رکھ دینا چاہیے کہ اس معاشرے کو آئندہ محض افسروں اور کلرکوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اچھے مسلمانوں اور اچھے انسانوں کی ضرورت ہے۔ نظامِ تعلیم کا فرض ہے کہ وہ نئی نسلوں کو اس نظریئے اور نصب العین سے مالا مال کرکے لائے جس پر ہمارا نیا دستور مبنی ہے۔ وہ ان کے دماغوں پر محض "معلومات" کے انبار لاد لاد کر ان کو فارغ نہ کرتا چلا جائے بلکہ اب ان کو ایک مضبوط اسلامی کردار سے بھی آراستہ کرنے کی ذمہ داری لے۔

اس تبدیلی کے لیے سرے سے فلسفۂ تعلیم کو بدلنا ہوگا، نصاب کا نقشہ بالکل دوسرا اختیار کرنا ہوگا، معلم کے پارٹ کو بہت زیادہ وسیع کرنا ہوگا اور درسگاہوں اور ٹریننگ کالجوں کے ماحول کو نئی ساخت دینی ہوگی۔ محض اتنے سے اقدام سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہو سکتا کہ آپ دینیات کا ایک پیریڈ رکھ دیں، اور ایک کتاب مقرر کر دیں۔ تعلیم کا مقصد اور زاویۂ نظر اور اس کا مزاج بدلنے کی ضرورت ہے۔

اصلاحِ تعلیم کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری کام توسیعِ تعلیم کا ہے۔ یہ واضح ہے کہ کسی بھی نظامِ زندگی ––– اور خصوصاً اسلامی نظامِ زندگی ––– کو ایسے عوام کو ساتھ لے کر نہیں چلایا جا سکتا جو جاہل ہونے کی وجہ سے نہ اس نظامِ زندگی کے نظریے اور اس کے تقاضوں کو سمجھتے ہوں اور نہ روزمرہ کے ملکی و بین الاقوامی حالات کو جانتے ہوں۔ پس ہماری اوّلین ضرورتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جلد سے جلد اپنی پوری آبادی کو کم سے کم ضروری معیار تک تعلیم یافتہ بنا دیں۔ اس کام کے لیے ایک بڑی مہم شروع کی جانی چاہیے جس میں ایک منصوبہ کے تحت سیاسی کارکن اور دفتری ملازمین، اساتذہ و طلبہ، مذہبی ادارے اور مسجدیں سب مل کر ایک ساتھ تعلیمِ بالغاں کا کام کریں۔ زیادہ سے زیادہ دس برس میں جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کے اندر ایک فرد بھی بے لکھا پڑھا نہ رہ جانا چاہیے۔

تعلیم کے مفہوم کو اگر ذرا وسیع کر کے لیا جائے تو اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ہماری نئی نسلوں کی ضروریات کے مطابق کافی درسگاہیں موجود ہوں اور تعلیمِ بالغاں کے ادارے کام کر رہے ہوں، بلکہ اسلام کے تقاضوں

اور زندگی کے نت نئے مسائل سے پوری قوم کو آگاہ کرنے اور اداۓ فرض کے لیے ذہنی طور پر تیار رکھنے کے لیے پورے ریاستی ذرائع و وسائل کو متحرک کر دینا چاہیے۔

مثلاً ریڈیو کو اگر آلۂ تعیش کے بجائے ایک ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جائے اور اس کے ذریعے مقصدی افادیت رکھنے والی نظمیں، کہانیاں، ڈرامے، مکالمے، فیچرز، تقاریر اور تفریحی پروگرام پیش کیے جائیں تو عوام کا ذہنی و فکری معیار تیزی سے بلند کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سرکاری اہتمام سے اگر مختلف بڑے شہروں میں ایسے فری سینما کھول دیئے جائیں جن میں جوہر افادیت کے ساتھ پاکیزہ تفریحی رنگ رکھنے والے فلم پیش کیے جائیں، نیز ایسے سفری سینماؤں کے ذریعے دیہاتی آبادیوں میں کام کیا جائے تو ہم اپنے عوام کو بہت جلد ملی نصب العین، ضروری معلومات اور مضبوط کیرکٹر سے آراستہ کر سکتے ہیں۔

ہمارے محکمہ ہائے تعلقات عامہ اس سلسلے میں بہت ہی موثر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ وہ اپنے اہتمام سے مفید اسلامی لٹریچر اور اسلامی جرائد کی اشاعت کا انتظام کریں، اسلامی اسپرٹ رکھنے والا جو لٹریچر ملک میں شائع ہوتا ہے اس میں سے بہترین کتابوں پر سالانہ انعامات تقسیم کریں۔ اسلامی مقاصد کے لیے جو اخبارات اور جرائد تعلیم عوام کی مہم میں نمایاں حصہ لیں ان کی حوصلہ افزائی کریں اور ایسی علمی مجالس کا انعقاد وقتاً فوقتاً کراتے رہیں جن میں مفید مقصد تقاریر اور مباحثے ہوں۔ اسی طرح اگر خطیب اور واعظ حضرات کو احساس دلا کر ان کو تعمیری مقاصد کی خدمت پر متوجہ کر دیا جائے تو ان کا تعاون بہت مفید ہو سکتا ہے۔ الغرض ہر وہ سرگرمی جو ہماری اسلامی ریاست کے مطلوبہ انسان کی تیاری میں مفید حصہ ادا کرتی ہو اسے خاص اہتمام سے ترقی دی جائے۔

تعمیری کام کا مثبت عامل تعلیم ہے اور منفی عامل قانون۔ تدریس، لٹریچر، صحافت، پبلسٹی، تبلیغ وغیرہ سب تعلیم دینے کے طریقے ہیں اور ان کا مقصد مطلوب افکار و رجحانات کو پیدا کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف قانون، عدالت، پولیس اور جیل کا پورا نظام نامطلوب افکار و رجحانات کا انسداد کرنے میں

مصروف رہتا ہے۔ تعلیم آدمی کو وہ کچھ بنانا چاہتی ہے جو کچھ اسے ہونا چاہیے، قانون آدمی کو وہ کچھ بننے سے روکتا ہے جو کچھ اسے نہیں ہونا چاہیے۔ تعلیم دلیل سے کام لیتی ہے لیکن قانون قوت استعمال کرتا ہے۔ تعلیم وہ ضروری منفی کام نہیں کرسکتی جو قانون کرتا ہے اور قانون وہ لازمی مثبت فرض انجام نہیں دے سکتا جو تعلیم دیتی ہے۔ اس وجہ سے کسی بھی اصول اور نقشے پر تمدن کی عمارت اٹھائی ہو، ان دونوں اہم عوامل کو برابر استعمال کرنا پڑتا ہے۔

جس طرح اب تک ہمارا نظامِ تعلیم مجہول نقشے پر کام کر رہا ہے اسی طرح ہمارا قانونی نظام بھی نہایت بے ڈھنگا ہے۔ وہ ہماری آئیڈیالوجی، ہماری روایات، ہماری بنیادی اخلاقی اقدار اور ہمارے تمدنی مزاج سے بالکل بے تعلق ہو کر نشوونما پاتا رہا ہے۔ اب اگر ہم نئے دستوری فیصلوں کے مطابق اپنے سامنے ایک نظریہ اور ایک نصب العین متعین کر رہے ہیں اور اس نظریہ و نصب العین کے مطابق ہم زندگی کے ڈھانچے کو ہر پہلو سے بدلنا چاہتے ہیں تو پھر قانونی نظام کی بھی تدوینِ جدید ناگزیر ہے۔ جس طرز کی تبدیلی نظامِ تعلیم میں مطلوب ہے عین اسی کے مطابق اور اسی کے ساتھ ساتھ قانون میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔ تعلیم جن رجحانات کو استوار کرنا چاہے گی، قانون کا فرض ہوگا کہ وہ ان کے مخالف رجحانات کا سدِّباب کرے۔ ورنہ اگر تعلیم نئے مقاصد کے لیے اپنا مثبت فرض ادا کرنا چاہے اور قانون اسی کے مطابق اپنا منفی حصہ تعمیر میں نہ لے تو سارا تعلیمی کام بھی رائگاں جائیگا۔ بالکل ایسے ہی جیسے مریض کو بہترین دوائیں اور سازگار ترین غذائیں کھلاتے ہوئے اگر پرہیز نہ کرایا جاسکے تو دواؤں اور غذاؤں کا عمل اکارت جاتا ہے۔

قانون کو کتاب و سنت کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم خود دستور کا ایک جزو بن چکا ہے لیکن دستور کے اس اہم ترین جزو میں بڑے جھول اور رخنے ہیں۔ جھول اور رخنے نہ بھی ہوں تو بھی بغیر انقلابی حوصلوں کے مطلوبہ کام صحیح رفتار سے نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر بدقسمتی سے وانستہ چھوڑے ہوئے ہر خلاء اور ہر رخنے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا تہیہ کرلیا جائے تو پھر کچھ بھی نہیں ہونے کا! ہاں، اگر کچھ کر دکھانے کی نیت پیدا ہو جائے تو موجودہ صورت کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ سو اگر قوم کی زندگی کو بنانا سنوارنا ہو تو قانون کی تدوینِ نو پوری سرگرمی سے کی جانی چاہیے۔ اس کے لیے مرکزی کمیشن کے علاوہ سرکاری اور غیر سرکاری

طور پر تحقیقی اداروں اور مجالس کی تشکیل ہونی چاہیے، اسلامی قانون پر نیا لٹریچر تیار ہونا چاہیے اور سابق علمی ذخیرے کو انگریزی اور اردو میں منتقل ہونا چاہیے اور لا کالجوں کے نصاب کو بدلنا چاہیے۔

ہمارے بے شمار معاشرتی مفاسد اور اخلاقی پستیوں کا ایک بڑا سبب موجودہ غیر اسلامی اور غیر منصفانہ معاشی نظام ہے۔ یہ روز افزوں طبقاتی تفاوت پیدا کر رہا ہے، جس کا نتیجہ طبقاتی کشمکش کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنانے والا ہے۔ اس کا یہ تباہ کن عمل آہستہ آہستہ ہمارے درمیانی طبقے کو بالکل ختم کر کے رکھ دیگا جو قومی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے بے روزگاری اور معاشی محرومی کی بلا ہمارے زیادہ سے زیادہ افراد کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہے۔ ہماری اکثریت کا حال یہ ہے کہ اسے روٹی اور کپڑے اور رہنے کے مکان اور دوا دارو کے ابتدائی مسائل اتنی فرصت ہی نہیں دیتے کہ دین و اخلاق اور قوم و ملت کے اعلیٰ تقاضوں کی طرف کچھ توجہ ہو سکے۔ انسانوں میں پیدا ہو کر ہمارے لاکھوں بھائی ڈھور ڈنگروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔
اس گندے اور ناپاک معاشی نظام کو جوں کا توں رکھ کر اصلاح و ترقی کا کوئی معمولی سا کام بھی نہیں کیا جا سکتا، کجا کہ اسلام کے اونچے آئیڈیل کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔ لہٰذا نئے دستور کے تحت نئی زندگی کی تعمیر کا کام شروع کرتے ہوئے اس سسٹم میں جرأت کے ساتھ کچھ تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے۔ تقاضا یہ نہیں کہ رات رات میں پورا انقلاب آ جائے، ضرورت اس بات کی ہے کہ دستور کے رہنما اصولوں میں معاشی اصلاح کا جو اسلامی نہج معین کیا گیا ہے اس کے مطابق جلد از جلد ضروری ابتدائی قدم اٹھائے جائیں۔ ناجائز نفع اندوزیوں، کاروباری اجارہ داریوں، ملازمین اور محنت پیشہ طبقوں کی حق تلفیوں اور موجودہ زرعی نظام کے نمایاں مفاسد کا فوری ازالہ ہونا چاہیے۔ نظام صنعت کو ابتدا ہی سے ان خطوط پر ارتقا کرنے سے روکا جائے جو مغربی سرمایہ داری نے قائم کیے ہیں، اور دنیا بھر کے تجربات کو سامنے رکھ کر اپنے اصولوں کے مطابق نیا راستہ نکالا جائے۔ تعمیری پہلو سے زکوٰۃ کی تنظیم کر کے اجتماعی کفالت کا سہارا ضرورت مندوں کے لیے فراہم کیا جائے۔ فوری مقصد یہ سامنے رکھا جائے کہ پاکستان کی سرزمین پر کوئی

فرد بے کار اور بے روزگار رہنے پر مجبور نہ ہو اور کوئی فرد زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہنے پائے۔

اسی طرح آگے کے وسیع تعمیری و اصلاحی منصوبوں کو سوچنے اور ہاتھ میں لینے سے قبل ملکی نظم و نسق کو صحت مند اور مضبوط بنانا بہت بڑی ضرورت ہے۔ ہماری دفتری زندگی کو بڑے بڑے روگ چمٹ گئے ہیں اور ان کی چھوت سے اوپر تلے کوئی گوشہ محفوظ نہیں رہ گیا۔ فرض ناشناسی عام ہے۔ ایک افسر اور ایک ملازم اس ذمہ داری کو سرے سے محسوس نہیں کرتا جو ریاست اور اس کے کروڑوں باشندوں کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہے بلکہ وہ ذاتی مفاد اور ذاتی خواہشات پر اپنے بڑے سے بڑے فرض کو قربان کر سکتا ہے۔ وہ وقت کی پابندی نہیں کرتا، وہ کام چوری کرتا ہے، وہ دفتر میں تضیع اوقات کرتا ہے، وہ پیچھے سے رشوت لیتا اور اوپر رشوت دیتا ہے، وہ قومی مال پر ہاتھ صاف کرتا ہے، وہ "ڈیوٹی" کے نام پر ذاتی کاموں کے لیے چھٹی لیتا اور سرکاری خرچ پر نجی سفر کرتا ہے، وہ قانون اور ضابطے کے ساتھ مذاق کرتا رہتا ہے، وہ دوستوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور مخالفوں سے انتقام لینے کے لیے اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں کو ہم ایک لفظ "خیانت" کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔ "خیانت" نظم و نسق کے لیے ایک طرح کا گھن ہے۔ اگر گھن اندر ہی اندر اس سارے ڈھانچے کو چاٹ جائے جس پر مملکت کا اقتدار کھڑا ہے تو چاہے باہر کتنا ہی خوشنما رنگ و روغن موجود ہو، ہر آن تباہی کا خطرہ درپیش رہے گا۔ ایسے بودے نظم و نسق کے بل پر معاشرے کی کسی خرابی کے خلاف جدوجہد کرنا یا کسی تعمیری و اصلاحی کام کو سرانجام دینا سرے سے ناممکن ہے۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ نظم و نسق کو چلانے والوں کے سامنے اوپر کی طرف سے امانت داری کی بے داغ مثال پیش کی جائے۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ ان لوگوں کو نصب العین دیا جائے جس کی بلندی ان کو موجودہ پستیوں سے اوپر کھینچ لے۔ تیسری ضرورت یہ ہے کہ نچلے ملازمین کی تنخواہوں میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ وہ اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ چوتھی ضرورت یہ ہے کہ مغربی ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کا وہ تعیش پسندانہ نمونہ ان کی نگاہوں سے ہٹا لیا جائے جس کو کم آمدنیوں کے

ساتھ حاصل کرنے کے لیے رشوت و خیانت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور جو کیریکٹر کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ ان تدابیر کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ خیانت اور فرض ناشناسی کے خلاف کسی قدر سختی سے انسدادی اقدامات کیے جائیں۔ نگرانی اور احتساب کو ذرا سخت کر دیا جائے اور جب کوئی واقعہ گرفت میں آجائے تو اس کی پوری تحقیقات کر کے عبرت ناک حد تک کڑی سزا دی جائے۔

اس سلسلے میں یہ بھی ناگزیر ہے کہ موجودہ ضابطۂ ملازمت کو بدل دیا جائے اور اسلامی ریاست کے افسروں اور ملازمین کے بارے میں جو اصول و ضوابط قرآن اور نبی صلعم نے پیش فرمائے ہیں اور جو ہدایات خلافتِ راشدہ میں دی جاتی رہی ہیں ان کو سامنے رکھ کر نیا ضابطہ مرتب کیا جائے۔ سول سروس کا معیارِ انتخاب مقرر کرنے میں ایک شخص کی اسلامیت اور اس کے اخلاق کو پوری پوری اہمیت دی جائے اور ترقیاں دینے میں بھی اس پہلو کا لحاظ رکھا جائے۔

جب نظم و نسق اور اس کے محکمہ ہائے احتساب ٹھیک سے ادائے فرض نہ کر رہے ہوں تو وہ اس قابل نہیں رہتے کہ معاشرہ کے عام لوگوں کو خیانت سے پاک رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس دائرے میں دیکھو، ہر شخص اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ فریب اور ٹھگی کرنے میں اور ان کو لوٹ کھانے میں مصروف ہے۔ ہر معاملے میں فریب کاری، ہر چیز میں ملاوٹ، ہر کام میں چوری، ہر سودے میں دھوکا۔ یہ ہے حالت جس سے ہر شخص دوچار ہے۔ یہاں اب انتظامی مشینری اور عام پبلک کے درمیان گویا بدی کا ایک چکر چل پڑا ہے۔ اُس کی خیانت اِس کو بگاڑتی ہے اور اس کی خیانت اُسے خراب کرتی ہے۔ اس چکر کو جتنا جلد ممکن ہو توڑ دینا چاہیے۔ نظم و نسق کی مشینری صحیح چال پکڑے تو پھر اس کے محکمہ ہائے احتساب پبلک کی اصلاح کرنے میں بہت مؤثر ثابت ہونگے۔

فوری طور پر اصلاح طلب گوشوں میں سے ایک ہماری معاشرتی زندگی کا گوشہ ہے۔ اس گوشے میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری اخلاقی قدریں اور ہماری بنیادی روایات روز بروز تباہ ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارے اندر شرافت کا جیسا کچھ معیار رائج چلا آرہا تھا وہ اس لحاظ سے غنیمت تھا

کہ اس کا شعور و احساس ہمیں بے شمار اخلاقی مفاسد سے بچاتا تھا۔ ایک آدمی کا یہ خیال کرنا کہ میں مسلمان ہوں، یہ سوچنا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں، یہ احساس کرنا کہ میں ایک اعلیٰ گھرانے یا خاندان سے تعلق رکھتا ہوں بہت سے موقعوں پر اسے پستی میں گرنے سے بچا لیتا تھا۔ اس طرح کے احساسات ہماری قدروں اور ہماری روایات کے محافظ تھے لیکن کچھ مدت سے یہ احساسات مضمحل ہو رہے ہیں اور معیارِ شرافت نگاہوں سے ہٹتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں جرائم بڑھ رہے ہیں بخصوصیت سے بدکاری اور اغوا کے واقعات کی داستانیں اخبارات ہر روز ہمارے سامنے لا کے پیش کرتے ہیں۔ اوباش اور غنڈہ عناصر اور نفسیاتی مریض تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ کسی گہرے تفکر کے بغیر ہی یہ حقیقت آدمی محسوس کر لیتا ہے کہ ہمارے ہاں عورتوں میں بے پردگی و آوارہ خرامی اور مخلوط تعلیم اور مخلوط مجالس کی ریت اور نام نہاد فحش آرٹ اور فلموں کی اشاعت جس رفتار سے بڑھ رہی ہے ٹھیک اسی رفتار سے جنسی جرائم ——— اور ان کے پہلو بہ پہلو دوسرے جرائم ——— بھی ترقی کر رہے ہیں۔ گھٹیا ادب، بازاری گانے، ننگے ناچ اور شراب کے کئی شیاطین مل کر ہماری خاندانی اور ازدواجی اور اخلاقی زندگی پر حملہ آور ہو گئے ہیں۔ یورپ کی بے خدا مادہ پرستانہ تہذیب کے ساتھ جس ڈھنگ کی معاشرت کھپ سکتی ہے، اس ڈھنگ کی معاشرت ایک مسلم قوم اور اسلامی ریاست کی تہذیب میں نہیں کھپ سکتی۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں اور دو متضاد چیزوں کو جب بھی جمع کیا جائے گا، نتیجہ فساد ہو گا۔

جدید مغربی معاشرت نہ صرف خدا کی محبت اور اس کے خوف کو دلوں سے نکال دیتی ہے بلکہ وہ انسان کو حیوان قرار دے کر، بلکہ اسے اجتماعی مشین کا ایک مادی پرزہ شمار کر کے انسانیت کے اس احترام کو ختم کر دیتی ہے جو آدمی اور آدمی کے درمیان ہمدردی و اخوت کا جذباتی و اخلاقی جوڑ لگاتا ہے۔ چنانچہ اس کا اثر جہاں جہاں پہنچ رہا ہے وہاں ہر فرد دوسرے افراد سے بے نیاز ہو کر اور اپنے آپ میں مگن رہ کر ایک لایعنی قسم کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہاں تک کہ باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، پڑوسی اور پڑوسی، شوہر اور بیوی کے گہرے جذباتی رشتے نہایت سطحی اور بودے ہو کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ ہمارا نظام معاشرت والدین کی اطاعت، اقربا کی محبت، شوہر کی قوامیت، پڑوسی کے احترام، محتاجوں کی دستگیری، مظلوموں کی حمایت اور فی نفسہٖ انسانیت کی قدرشناسی کے بل پر چل سکتا ہے۔ جو معاشرت اسلام کے ان اساسی تقاضوں کو تباہ کر دے اس کے زیر سایہ آخر ایک مسلمان

ملت اپنی تعمیرِ نَو کیا خاک کر سکتی ہے؟

یہ مغربی طرز کی معاشرت ایک ایسا ذہنی و عملی ماحول پیدا کرتی ہے کہ جس کے ساتھ اسلام کے تقاضے اور اصول پنپ ہی نہیں سکتے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایسے مصنوعی اور مستعار اور ناسازگار ماحول کے اندر کوئی مسلمان قوم سرے سے کسی ڈھنگ کی ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ مغرب کی فاسد معاشرت کی پرچھائیں قبول کر لینے کے بعد آزاد مسلمان قوموں میں سے کوئی ایک بھی درجۂ اوّل، بلکہ درجۂ دوم کی طاقت بننے کے قابل بھی نہیں ہو سکی۔

لہٰذا اس فاسد مغربی معاشرت کے سدِّباب کی فکر کرنا ناگزیر ہے۔ اس پہلو سے کچھ نہ کچھ محسوس قسم کے اصلاحی اقدامات فوراً ہونے چاہئیں۔

تمدن و معاشرت کا لباس ہوتا ہے کلچر! اور کسی قوم کا صحیح کلچر وہ ہوتا ہے جس کے سارے مظاہر میں اس قوم کی فکر و احساس کی روح بولتی ہے۔ ہر قوم کی جداگانہ ساخت، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کی ملّی خودی کلچر کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس وقت جو کلچر ہم اپنے ساتھ لے کے چل رہے ہیں اس میں ہمیں دوسروں کی آواز سنائی دیتی ہے، اپنی نہیں سنائی دیتی۔ اس میں دوسروں کا ذہن بولتا ہے، ہمارا اپنا ذہن نہیں بولتا۔ یہ مستعار کلچر ہماری ترجمانی نہیں کرتا۔ آج جو مجلسی آداب فروغ پا رہے ہیں، آج میل جول اور بول چال کے جو انداز پھیل رہے ہیں، آج لباسوں کی جو تراش خراش رائج ہو رہی ہے، اور سب تعمیرات اور دوسرے فنون کا جو مزاج بن رہا ہے اور جس اٹھان پر ہمارا جمالیاتی ذوق اُٹھ رہا ہے، اس میں ہمارا یہ شعور بالکل نہیں بولتا کہ "ہم مسلمان ہیں" اور نہ یہی احساس اس میں سے اپنی بولی سنا سکتا ہے کہ "ہم پاکستانی ہیں"۔ ہمارے کلچر میں ہمارے اعتقادات، ہمارے شعور، ہماری روایات اور ہماری اپنی تاریخ کی کوئی جھلک موجود نہیں ہے۔ گویا یہ بالکل مانگے تانگے کا بے تُکا لباس ہے جسے ہم نے اپنے ملّی قامت پر زبردستی آراستہ کر لیا ہے۔ اس پرائے لباس کو پہن کر ہم اپنی شخصیت کے شعور سے محروم ہو رہے ہیں، اس کی وجہ سے ہمیں اپنے بارے میں مغالطہ ہو رہا ہے۔ اور بلا شبہ یہ لباس ہمیں اپنے معیارِ شرافت کے احترام سے دُور ہٹا رہا ہے۔ معاشرت کی تعمیرِ نَو کے لیے نہایت ضروری امر یہ ہے کہ ہم اس اجنبی کلچر سے بھی نجات پانے کی فکر کریں۔ ہمیں اپنے تمدنی مظاہر میں، چاہے وہ آداب ہوں یا فنون، نئے سرے سے اسلامی

سے بنیادی تبدیلیاں کرنی ہیں۔ ہمارا کلچر وہ ہوگا جس کے ہر پہلو میں ہماری خودی کی آواز سنائی دے اور جس کے ذریعے ہم دنیا کے سامنے اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کر سکیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم پاکستانی ہیں۔ اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے ہمیں ہاپنے قامت پر راست کیا ہوا اپنے ہی ذوق کا لباس مطلوب ہے۔

دوسروں سے استفادہ، دوسرے ہر میدان کی طرح، کلچر میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف اس طرح کہ اجزا میں فطری کسر و انکسار ہو اور جو جز بھی اخذ کیا جائے وہ چھان پھٹک کر افادیت و ضرورت کی بنا پر لیا جائے اور اسے اپنے نظریے اور مزاج کے سانچے میں ڈھال کر پوری طرح اپنا لیا جائے۔ اور کلچر کا ہر وہ عنصر جو ہماری آئیڈیالوجی سے ٹکراتا ہو جو ہماری ملی روح کا ترجمان نہ ہو اسے چھانٹ کر الگ کر دیا جائے۔ نہ یہ کہ سرتاپا نقل مطابق اصل تیار کر لی جائے۔

پس کلچر اور آرٹ اور آداب و اطوار کے میدان میں بھی جرأت مندانہ اقدامات کی ضرورت ہے۔

جس ملک کے لوگوں میں دفاعی لحاظ سے اپنی "کمزوری" کا احساس پایا جاتا ہو، وہ کسی دشمن یا دراز دست طاقت کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کریں، ان میں ایک طرح کا قومی احساس کہتری پیدا ہو جاتا ہے، وہ کسی درجے میں حالتِ خوف میں رہتے ہوں، ایسے ملک کی زندگی میں کبھی بالیدگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو قوم بھی دوسروں کے مظالم کا ہدف بنتی رہے اور کسی موقع پر جواباً مدافعتی اقدامات کافی حد تک نہ کر سکے، بلکہ محض چیخ پکار اور احتجاج کر کے رہ جاتی ہو اس کی غیرت و حمیت کا جوہر فنا ہو جاتا ہے اور پھر نہ اس کے افکار میں بلندی آ سکتی ہے، نہ اس کے کردار کی سطح بلند ہو سکتی ہے۔

ایک ایسے گھر کا تصور کیجیے جس کی دیواریں چاند کر اُٹھائی گیرے دن رات ہاتھ صاف کرتے رہتے ہوں، جس کے ناموس پر غنڈے کھلے بندوں چھاپے مارتے رہتے ہوں، جس کی حدود میں راہ چلتے لوگ گھس کر بستر جما سکتے ہوں اور جس کے مالکوں میں اپنی ملکیت اور عزت کی حفاظت کرنے کی پوری پوری سکت نہ ہو اس گھر کے مکینوں میں عزت و سربلندی اور ترقی کرنے اور کوئی تعمیری مہم اٹھانے کا حوصلہ کہاں سے آئے گا۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی ملک دفاعی لحاظ سے اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگے اور اس پر آسٹن

حریفوں کی طرف سے دست درازیاں ہوتی رہیں تو اس کے باشندوں میں فکری و جذباتی اطمینان کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

ایک قوم اگر داخلی لحاظ سے کسی تعمیری مہم کو لے کے چلنا چاہتی ہو تو اشد ضروری ہے کہ اس کا دفاع پوری طرح مضبوط ہو۔ اس کے اندر قومی حمیت و خودداری کارفرما ہو۔ وہ اپنی سرحدات سے کسی غیر کے قدموں کو چھونے نہ دے اور کسی بیگانہ طاقت کو اپنی سرزمین کا ایک ذرہ اپنی جگہ سے ہلانے کا اذن نہ دے۔ کسی کو جرأت نہ ہو کہ اس کی آزادی اور اس کے حقوق کی طرف ترچھی نگاہ ڈال سکے۔ ورنہ مخالفوں اور حریفوں کے مقابلے میں ایک احساس کمتری اور ایک عالم خوف زدگی پیدا ہو جاتا ہے اور عوام بزدلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بزدلی وہ مفسدہ ہے جو اگر ایک بار قومی زندگی میں آگھسے تو پھر کوئی تعمیر و ترقی ممکن نہیں رہتی۔ تعمیر و ترقی تو ہمیشہ بہادرانہ جذبات کے بل پر ہوتی ہے۔

پاکستان اپنی سرحدوں کے باہر کچھ حریف رکھتا ہے۔ ان کی طرف سے برابر چیرہ دستیاں ہوتی رہتی ہیں۔ گذشتہ آٹھ برس میں بے شمار ناخوش آئند حرکات ہمارے خلاف کی جا چکی ہیں۔ سرحدوں پر جھڑپیں بار بار ہوتی ہیں اور ان میں نہ صرف اغیار کی طرف سے پہل اور زیادتی ہوتی ہے بلکہ بعض جھڑپوں کے نتیجے میں کھلم کھلا ہمارے حقوق چھینے جاتے ہیں اور ہمارے قومی گھر کے کسی حصے میں جبراً آتشیں جمایا جاتا ہے۔ ایسے واقعات پر ایک زندہ و بیدار قوم کی حمیت جوش میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی اور دنیا میں ہمیشہ ایسی صورت میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے لیکن ایک ہم ہیں کہ احتجاجی چیخ پکار کر کے اور ناقابل اعتماد طاقتوں کے سامنے عرضی پرچہ کر کے، یا زیادہ سے زیادہ اپنے صلح پسندانہ جذبات کا واسطہ دلا کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارے کسی دشمن کو گویا یہ ڈر سرے سے رہا ہی نہیں کہ اگر وہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھے گا تو ملت پاکستان اس کا سینہ چھید ڈالے گی۔

یہ درست کہ دفاع کا انحصار طاقت پر ہے اور ہم جو کچھ بھی جذبہ دشمن طاقتوں کے مقابلے میں دکھا سکتے ہیں یا دشمن طاقتیں جو کچھ بھی تاثر ہمارے بارے میں لے سکتی ہیں وہ ہماری طاقت ہی کے اندازے پر لے سکتی ہیں۔ لیکن کیا ہم طاقت کے لحاظ سے اتنے گئے گزرے ہیں کہ ہم طلسم ہیچ مقداری کا شکار ہو کر رہ جائیں۔ بعض اوقات خود یہ طلسم ہیچ مقداری فراہم شدہ طاقت کو غیر مؤثر اور کم تر بنا دیتا ہے۔ علاوہ بریں طاقت سپاہیوں اور اسلحہ کی تعداد ہی کا نام نہیں ہے۔ قومی عزم و ہمت اور غیرت و حمیت خود ایک طاقت ہے جو مادی طاقت کا اثر کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ اگر ایک قوم کے افراد میں یہ داعیہ موجود ہو کہ

اگر کوئی حریف اس کے حدود یا اس کے حقوق کی طرف کوئی ظالمانہ اقدام کرے گا تو بوڑھے بچے مرد عورتیں اس کی مزاحمت کے لیے نکل کھڑے ہوں گے اور گروہ در گروہ بھی اور اکیلے اکیلے بھی، اسلحہ اور سروسامان سے لد کر بھی اور نہتے ہوتے ہوئے بھی وہ مرنے مارنے کا معرکہ بپا کر دیں گے تو ایسی قوم کے منہ آنا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ ضرورت ہے کہ اس اسپرٹ کو بروئے عمل لایا جائے۔ لیکن ایسی اسپرٹ پورا پورا کام جبھی کر سکتی ہے کہ لوگوں کو اس دور کی جنگ کے فنون اور اسالیب کا علم ہو اور وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت رکھتے ہوں۔ افسوس ہے کہ قوم کو یہ تربیت بھی نہ دی جا سکی۔ دو ایک موقعوں پر ہنگامی طور پر ایک حرکت پیدا ہوئی تھی، لیکن پھر اوس پڑ گئی۔ اور اس وجہ سے پڑ گئی کہ عوام مسلح ہونا چاہتے تھے لیکن ان کو اسلحہ فراہم نہیں کیا جا سکا۔ کیا وجہ ہے کہ یہ ضرورت آٹھ برس میں پوری نہ ہو سکی۔ اتنی لمبی مدت میں کسی نہ کسی طرح کی شرائط پر کسی نہ کسی ملک سے معاملہ کیا جا سکتا تھا۔ بین الاقوامی حالات میں جو پلٹیاں آتی رہی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، خارجہ پالیسی کو ایسے خطوط پر موڑا جا سکتا تھا کہ یہ ضرورت پوری ہو۔ یہ بھی نہیں تو آخر اتنی مدت میں اندرون ملک ہلکے اسلحہ کی ساخت کی مہم زور شور سے چلائی جا سکتی تھی۔ اس ضرورت کے لیے خود سازی کا کوئی فارمولا مسلسل تجربات کر کے نکالا جا سکتا تھا۔ پچھلا وقت ضائع ہو گیا تو اب آئندہ جلد سے جلد تلافی کرنے کی فکر کی جانی چاہیے۔

لیکن قوم کو مسلح کرنے کے لیے سب سے بڑا لازمہ یہ ہوتا ہے کہ حکمراں طاقت اور عوام کے درمیان محبت و اعتماد کا رشتہ قائم ہو۔ یہ رشتہ اگر کمزور ہو تو حکمراں طاقت کبھی عوام کو اسلحہ سے آراستہ نہیں کر سکتی۔ خدانخواستہ اگر اس طرح کی کوئی رکاوٹ موجود ہو تو پھر ان وجوہ کو جلد از جلد دور کرنا چاہیے جو اس رشتہ کے قیام میں حائل ہیں۔ اس رشتہ کے بغیر نہ باہر سے خیر ہوتی ہے، نہ اندر کوئی کام کیا جا سکتا ہے۔

دفاعی طاقت کو بنانے کے سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر جو معاہداتی روابط استوار کیے گئے ہیں، فی نفسہ ان کی ضرورت و اہمیت ثابت کی جا سکتی ہے، لیکن ان روابط کے سلسلے میں جو غلط اور مضر

تاثر یہاں پیدا ہو گیا ہے وہ یہ ہے کوئی دوسری طاقت ہمارا بچاؤ کرے گی۔ یہ تاثر ایک آزاد قوم کے لیے سخت مہلک ہے۔ زندہ وہی لوگ رہ سکتے ہیں جو اپنے بارے میں خود اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتے ہوں اور جو اپنے وجود اور اپنی آزادی اور اپنی عزت کے بچاؤ کا انحصار کسی دوسرے پر نہ رکھیں۔ جتنا جلد ممکن ہو، اہل پاکستان کو اُس غلط تاثر سے نکال لینا چاہیے جو غیر ملکی معاہدانہ روابط کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے۔

بہر حال زندگی کی تعمیرِ نو کے لیے لازم ہے کہ دفاعی جذبہ اور دفاعی طاقت دونوں کو مستحکم کیا جائے اور اسے اتنا حساس بنا دیا جائے کہ کسی خارجی زیادتی کو قوم چپ چاپ برداشت کرنے پر تیار نہ ہو۔

دفاع ہی کی طرح خارجی پالیسی کی مضبوطی کی ضرورت ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ہماری خارجہ پالیسی کو بار بار ناکامی سے سابقہ پیش آیا ہے۔ بار بار ہم نے بین الاقوامی میدانِ مسابقت میں حریفوں سے زک اٹھائی ہے۔ اور کتنی ہی مرتبہ نادم ہو کر سر جھکا دینا پڑا ہے۔

ایک نوخیز ریاست کو اپنا تعارف بھی کرانا ہوتا ہے اور اپنی ساکھ بھی بالکل نئے سرے سے بنانی ہوتی ہے۔ پھر اگر وہ نوخیز ریاست دنیا جہاں سے الگ ایک اصول و نظریہ کو لے کر اٹھی ہو تو اس کی ذمہ داریاں اور بھی پیچیدہ اور نازک ہو جاتی ہیں۔ اسے گہری حریفانہ چالوں اور نہایت مضر قسم کے مخالفانہ پروپگنڈے سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایسے عالم میں بڑی ذہانت اور بیدار مغزی اور مہارتِ کار کی ضرورت ہوتی ہے۔

مسئلۂ کشمیر اور انڈیا سے دوسرے جملہ تنازعات میں ہمیں شروع سے آخر تک ناکامی پیش آئی ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی دھڑوں کے درمیان ہم نے جو موقف اختیار کیا بہت جلد محسوس ہو گیا کہ وہ کمزور پالیسی کا مظہر ہے۔ امریکی امداد جس کے لیے بڑی ہاؤ ہو رہی ہے، ہمارے مسائل کو حل نہ کر سکی۔ مسلمان حکومتوں کے ساتھ ہم مضبوط بنیادوں پر کوئی مستقل معاہداتی رابطہ استوار نہ کر سکے۔ اقوام کی برادری میں اس طرح زک پر زک اٹھانے کے نتیجے میں کسی قوم کے اندر بے چارگی اور بے بسی اور نالائقی کا احساس پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جس کا نتیجہ مایوسی و قنوطیت ہوتا ہے۔ آخر مایوسی و قنوطیت کے بل پر کونسا کام کیا جا سکتا ہے۔

اب اگر خارجہ پالیسی کو از سرِ نو بنانا ہو تو اس کے لیے حسب ذیل بنیادیں اختیار کرنی چاہئیں:-

۱۔ دوسری قوموں اور طاقتوں کی حمایت و سرپرستی کی مقابلے میں اپنے عوام کے جذبۂ تعاون کو زیادہ اہمیت دی جائے اور بین الاقوامی معاملات و روابط کے لیے ہر مرحلے پر رائے عام کو ہموار کیا جائے اور ساتھ لیا جائے۔

۲۔ دنیا کی کسی بھی طاقت کو بالکلیہ اپنی باگ ڈور نہ تھما دی جائے اور نہ کسی پر اندھا اعتماد کر کے بُرا بھلا اس پر چھوڑا جائے۔

۳۔ خارجہ پالیسی میں خودداریٔ ملّت کی اسپرٹ کو پوری طرح برقرار رکھا جائے اور اپنی مجبوریوں کا غیر معمولی حد تک ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر بھکاریوں کی سی پوزیشن اختیار نہ کی جائے؛ نہ ہی یہ مناسب ہے کہ ضرورت سے زیادہ دباؤ کے تحت گر گر کر معاملات کیے جائیں۔ اہتمام کیا جائے کہ پاکستان کسی کا آلۂ کاربن کے استعمال نہ ہونے لگے اور پرائے شگون کے لیے اپنی ناک نہ کٹواتا پھرے۔

۴۔ تمام غیر ملکی روابط اور معاملات میں قوم کی نمائندگی کا ذریعہ ایسے ذہین لوگوں کو بنایا جائے جو اپنی آئیڈیالوجی اور اپنے کلچر اور اپنے مفاد کے سچے ترجمان ہوں۔ سفارتی مناصب کو سیاسی سودابازیوں کی متاع نہ بنایا جائے۔

۵۔ خارجہ پالیسی بنانے میں ہمیشہ اپنی آزادی اور اپنے نصب العین کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

مناسب ہوگا کہ اس طرح کی ضروری تبدیلیوں کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جائے اور ہر شعبہ کے لیے تبدیلی کا منصوبہ بنانے کا کام ماہرین کے ایک بورڈ کے سپرد کیا جائے۔ تعمیر و اصلاح کے پورے کام کو زیادہ سے زیادہ دس سال کی مدت پر پھیلا کر اسے دو پنج سالہ منصوبوں میں بانٹ دیا جائے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے کام کو سال وار تقسیم کیا جائے اور یہ نقشہ سامنے آ جائے کہ ۱۹۵۶ء میں اتنا اتنا کام فلاں فلاں شعبے میں کر لیا جانا ہے، اتنا ۵۷ء میں اور اتنا اتنا آئندہ سالوں میں۔ اس طرح کا نقشۂ عمل اگر پورے عزم کے ساتھ قوم کے سامنے رکھ دیا جائے

تو عام لوگوں میں بھی عملی اسپرٹ بیدار ہوگی اور وہ محسوس کریں گے کہ اب فی الواقع کام ہونے لگا ہے۔

خریدارانِ ترجمان القرآن سے ضروری گذارشات

(۱) کم از کم پانچ پرچوں پر ایجنسی دی جاتی ہے۔

(۲) پرچہ ایجنسی ہر ماہ وی پی ارسال کیا جاتا ہے۔

(۳) ۵ سے ۴۹ پرچوں پر پچیس فی صد کمیشن، پچاس سے چوہتر پرچوں پر ۳۰ فی صد کمیشن اور پچھتر سے زائد پر جتنے بھی منگوائے جائیں "پینتیس" فی صدی کمیشن دیا جاتا ہے۔

(۴) ڈاک خرچ بذمہ دفتر ہوتا ہے۔

(۵) اگر کوئی صاحب پرچہ ایجنسی واپس کر دیں اور پھر وہی پرچہ دوبارہ منگوائیں تو ڈاک خرچ ایجنٹ کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ رسالہ ترجمان القرآن کے پرانے خریداروں سے گذارش ہے کہ منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر مکمل پتہ اور نمبر خریداری صاف تحریر فرمایا کریں۔

اگر کوئی صاحب نئے خریدار بننا چاہیں تو منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر مکمل پتہ تحریر فرمائیں اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمائیں کہ میں نیا خریدار ہوں اور فلاں ماہ سے پرچہ جاری کیا جائے۔ خریدار حضرات خط و کتابت کرتے وقت بھی پتہ اور نمبر خریداری ضرور تحریر فرمایا کریں۔ اگر پتہ بدلنا ہو تو پرانا پتہ، نیا پتہ اور نمبر خریداری کا ضرور تحریر فرمایا کریں۔ ورنہ اس کے بغیر تعمیل مشکل ہوگی۔

محمد نافع الدین

دفتر ترجمان القرآن

تفہیم القرآن

النُّور

(۶)

تم میں سے جو لوگ مجرّد ہوں[50]، اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں[51]، ان کے نکاح کر دو[52]۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا[53]، اللہ بڑی وسعت وا

---

[50] اصل میں لفظ اَیامیٰ استعمال ہوا ہے جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ عورتوں کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ حالانکہ دراصل اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو بے زوج ہوں۔ ایامیٰ جمع ہے اَیِّم کی اور ایّم ہر اُس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو، اور ہر اُس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی شوہر نہ ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ مجرّد کیا ہے۔

[51] یعنی جن کا رویّہ تمہارے ساتھ بھی اچھا ہو، اور جن میں تم یہ صلاحیت بھی پاؤ کہ وہ ازدواجی زندگی نباہ لیں گے۔ مالک کے ساتھ جس غلام یا لونڈی کا رویّہ ٹھیک نہ ہو اور جس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بھی نہ ہو کہ شادی ہونے کے بعد اپنے شریکِ زندگی کے ساتھ اس کا نباہ ہو سکے گا، اُس کا نکاح کر دینے کی ذمہ داری مالک پر نہیں ڈالی گئی ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے فرد کی زندگی خراب کرنے کا ذریعہ بن جائیگا۔ یہ شرط آزاد آدمیوں کے معاملے میں نہیں لگائی گئی، کیونکہ آزاد آدمی کے نکاح میں حصہ لینے والے کی ذمہ داری درحقیقت ایک مشیر، ایک معاون اور ایک ذریعۂ تعارف سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اصل رشتہ ناکح اور منکوح کی اپنی ہی رضامندی سے ہوتا ہے۔ لیکن غلام یا لونڈی کا رشتہ کرنے کی پوری ذمہ داری اس کے مالک پر ہوتی ہے۔ وہ اگر جان بوجھ کر کسی غریب کو ایک بدمزاج اور بدسرشت آدمی کے ساتھ بندھوا دے تو اس کا سارا وبال اُسی کے سر ہوگا۔

انہ علیم ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہیے کہ عفت مآبی اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ

۵۲ــہ بظاہر یہاں صیغۂ امر دیکھ کر علماء کے ایک گروہ نے یہ خیال کر لیا کہ ایسا کرنا واجب ہے۔ حالانکہ معاملے کی نوعیت خود بتا رہی ہے کہ یہ حکم وجوب کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کا نکاح کر دینا دوسروں پر واجب کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر کس کا کس سے نکاح کر دینا واجب ہو؟ اور بالفرض اگر واجب ہو بھی تو خود اس شخص کی کیا حیثیت رہی جس کا نکاح پیشِ نظر ہے؟ کیا دوسرے لوگ جہاں بھی اس کا نکاح کرنا چاہیں اسے قبول کر لینا چاہیے؟ اگر یہ اس پر فرض ہے تو گویا اس کے نکاح میں اس کی اپنی مرضی کا دخل نہیں، اور اگر اسے انکار کا حق ہے تو جن پر یہ کام واجب ہے وہ آخر اپنے فرض سے کس طرح سبکدوش ہوں؟ انہی پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر جمہور فقہاء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کام کو واجب نہیں بلکہ مندوب قرار دیتا ہے۔ یعنی اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو عام طور پر یہ فکر ہونی چاہیے کہ ان کے معاشرے میں لوگ بن بیاہے نہ بیٹھے رہیں۔ خاندان والے، دوست، ہمسائے سب اس معاملے میں دلچسپی لیں، اور جس کا کوئی نہ ہو اس کو حکومت اس کام میں مدد دے۔

۵۳ــہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس کا بھی نکاح ہو جائیگا اللہ اس کو مالدار بنا دیگا، بلکہ مدعا یہ ہے کہ لوگ اس معاملے میں بہت زیادہ حسابی بن کر نہ رہ جائیں۔ اس میں لڑکی والوں کے لیے بھی ہدایت ہے کہ نیک اور شریف آدمی اگر ان کے ہاں پیغام دے تو محض اس کی غربت دیکھ کر انکار نہ کر دیں۔ لڑکے والوں کو بھی تلقین ہے کہ کسی نوجوان کو محض اس لیے نہ بٹھا رکھیں کہ ابھی وہ بہت نہیں کما رہا ہے اور خود نوجوانوں کو بھی نصیحت ہے کہ زیادہ کشائش کے انتظار میں اپنی شادی کے معاملے کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں۔ تھوڑی آمدنی یا غیر یقینی آمدنی بھی ہو تو اللہ کے بھروسے پر شادی کر ڈالنی چاہیے۔ بسا اوقات خود شادی ہی آدمی کے حالات درست ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بیوی کی مدد سے اخراجات قابو میں آجاتے ہیں۔ ذمہ داریاں سر پر آجانے کے بعد آدمی خود بھی پہلے سے زیادہ محنت اور کوشش کرنے لگتا ہے۔ بیوی معاش کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ مستقبل میں کس کے لیے کیا لکھا ہے، اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ اچھے حالات بُرے حالات میں بھی بدل سکتے ہیں اور بُرے حالات اچھے حالات میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آدمی کو ضرورت سے زیادہ حساب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا۔[54]

اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں[55] ان سے مکاتبت کر لو[56] اگر تمہیں معلوم

۵۴؎ ان آیات کی بہترین تفسیر وہ احادیث ہیں جو اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا یامعشر الشباب، من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فانه له وجاء "نوجوانو! تم میں سے جو شخص شادی کر سکتا ہو اسے کر لینی چاہیے کیونکہ یہ نگاہ کو بدنظری سے بچانے اور آدمی کی عفت قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور جو استطاعت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے۔ کیونکہ روزے آدمی کی طبیعت کا جوش ٹھنڈا کر دیتے ہیں" (بخاری ومسلم)۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ثلثة حق علی اللہ عونهم، الناکح یرید العفاف، والمکاتب یرید الاداء، والغازی فی سبیل اللہ "تین آدمی ہیں جن کی مدد اللہ کے ذمّے ہے: ایک وہ شخص جو پاک دامن رہنے کے لیے نکاح کرے، دوسرے وہ مکاتب جو مال کتابت ادا کرنے کی نیت رکھے، تیسرے وہ شخص جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے" (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)۔

۵۵؎ مکاتبت کے لفظی معنی تو ہیں "لکھا پڑھی"، مگر اصطلاح میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے کہ کوئی غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لیے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے اور جب آقا اسے قبول کرے تو دونوں کے درمیان شرائط کی لکھا پڑھی ہو جائے۔ اسلام میں غلاموں کی آزادی کے لیے جو صورتیں رکھی گئی ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ معاوضہ مال ہی کی شکل میں ہو۔ آقا کے لیے کوئی خاص خدمت انجام دینا بھی معاوضہ بن سکتا ہے بشرطیکہ فریقین اس پر راضی ہو جائیں۔ معاہدہ ہو جانے کے بعد آقا کو یہ حق نہیں رہتا کہ غلام کی آزادی میں بیجا رکاوٹیں ڈالے۔ وہ اس کو مال کتابت فراہم کرنے کے لیے کام کرنے کا موقع دیگا اور مدت مقررہ کے اندر جب بھی غلام اپنے ذمّے کی رقم یا خدمت انجام دے دے، وہ اس کو آزاد کر دے گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک غلام نے اپنی مالکہ سے مکاتبت کی اور مدت مقررہ سے پہلے ہی مال کتابت فراہم کر کے اس کے پاس لے گیا۔ مالکہ نے کہا کہ میں تو یک مشت نہ لوں گی بلکہ سال بسال اور ماہ بماہ قسطوں کی صورت میں لونگی۔ غلام نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا یہ رقم بیت المال

میں داخل کر دے اور جا تو آزاد ہے۔ پھر مالک کو کہلا بھیجا کہ تیری رقم یہاں جمع ہو چکی ہے، اب تو چاہے یکمشت لے ورنہ ہم تجھے سال بسال اور ماہ بماہ دیتے رہیں گے (دارقطنی بروایت ابوسعید مقبری)

۵۶۔ اس آیت کا مطلب فقہاء کے ایک گروہ نے یہ لیا ہے کہ جب کوئی لونڈی یا غلام مکاتبت کی درخواست کرے تو آقا پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ یہ عطاء، عمرو بن دینار، ابن سیرین، مسروق، ضحاک، عِکرِمہ، ظاہریہ اور ابن جَریر طَبَری کا مسلک ہے اور امام شافعی بھی پہلے اسی کے قائل تھے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ واجب نہیں ہے بلکہ مُستحَب اور مَندوب ہے۔ اس گروہ میں شَعبی، مُقاتِل بن حَیّان، حسن بصری، عبدالرحمان بن زید، سُفیان ثَوری، ابوحنیفہ اور مالک بن انس جیسے بزرگ شامل ہیں، اور آخر میں امام شافعی بھی اسی کے قائل ہو گئے تھے۔ پہلے گروہ کے مسلک کی تائید دو چیزیں کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ آیت کے الفاظ ہیں کَاتِبُوھُم "اُن سے مکاتبت کر لو"۔ یہ الفاظ صاف طور پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ دوسرے یہ کہ معتبر روایات سے ثابت ہے کہ مشہور فقیہ و محدث حضرت محمد بن سیرین کے والد سیرین نے اپنے آقا حضرت اَنَس سے جب مکاتبت کی درخواست کی اور انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سیرین حضرت عمرؓ کے پاس شکایت لے گئے۔ انہوں نے واقعہ سُنا تو دُرّہ لے کر حضرت انس پر پل پڑے اور فرمایا "اللہ کا حکم ہے کہ مکاتبت کر لو" (بخاری)۔ اس واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا ذاتی فعل نہیں تھا بلکہ صحابہ کی موجودگی میں کیا گیا تھا اور کسی نے اس پر اظہار اختلاف نہیں کیا، لہٰذا یہ اس آیت کی مستند تفسیر ہے۔ دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف فَکَاتِبُوھُم نہیں فرمایا ہے بلکہ فَکَاتِبُوھُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْھِمْ خَیْرًا ارشاد فرمایا ہے، یعنی "ان سے مکاتبت کر لو اگر ان کے اندر بھلائی پاؤ"۔ یہ بھلائی پانے کی شرط ایسی ہے جس کا انحصار مالک کی رائے پر ہے، اور کوئی متعین معیار اس کا نہیں ہے جسے کوئی عدالت جانچ سکے۔ قانونی احکام کی یہ شان نہیں ہوا کرتی۔ اس حکم کو تلقین اور ہدایت ہی کے معنی میں لیا جائے گا نہ کہ قانونی حکم کے معنی میں۔ اور سیرین کی نظیر کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اُس زمانے میں کوئی ایک غلام تو نہ تھا جس نے مکاتبت کی درخواست کی ہو۔ ہزارہا غلام عہد نبوی اور عہدِ خلافت راشدہ میں موجود تھے، اور بکثرت غلاموں نے مکاتبت کی ہے۔ سیرین والے واقعہ کے سوا کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ کسی آقا کو عدالتی حکم کے ذریعہ سے مکاتبت پر مجبور کیا گیا ہو۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کے اس فعل کو ایک عدالتی فعل سمجھنے کے

ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے[۵۷]؛ اور ان کو اُس مال سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے[۵۸]۔

بجائے ہم اس معنی میں لیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے درمیان محض قاضی ہی نہ تھے بلکہ افرادِ ملت کے ساتھ ان کا تعلق باپ اور اولاد کا سا تھا۔ بسا اوقات وہ بہت سے ایسے معاملات میں بھی دخل دیتے تھے جن میں ایک باپ تو دخل دے سکتا ہے مگر ایک حاکمِ عدالت دخل نہیں دے سکتا۔

۵۷ھ بھلائی سے مراد تین چیزیں ہیں۔

ایک یہ کہ غلام میں مالِ کتابت ادا کرنے کی صلاحیت ہو۔ یعنی وہ کما کر یا محنت کر کے اپنی آزادی کا فدیہ ادا کر سکتا ہو۔ جیسا کہ ایک مُرسل حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ان علمتم فیہم حرفۃً ولا ترسلوھم کلاًّ علی الناس "اگر تمہیں معلوم ہو کہ وہ کما سکتا ہے تو مکاتبت کرو۔ یہ نہ ہو کہ اسے لوگوں سے بھیک مانگتے پھرنے کے لیے چھوڑ دو" (ابن کثیر بحوالہ ابی داؤد)

دوسرے یہ کہ اس میں اتنی دیانت اور راست بازی موجود ہو کہ اس کے قول پر اعتماد کر کے معاہدہ کیا جا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ مکاتبت کر کے وہ مالک کی خدمت سے چھٹی بھی پا لے اور جو کچھ اس دوران میں کمائے اسے کھا پی کر برابر بھی کر دے۔

تیسرے یہ کہ مالک اس میں ایسے بُرے اخلاقی رجحانات، یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے ایسے تلخ جذبات نہ پاتا ہو جن کی بنا پر یہ اندیشہ ہو کہ اس کی آزادی مسلم معاشرے کے لیے خطرناک ہوگی۔ بالفاظ دیگر اُس سے یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ مسلم معاشرے کا ایک اچھا آزاد شہری بن سکے گا نہ کہ آستین کا سانپ بن کر رہے گا۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ معاملہ جنگی قیدیوں کا بھی تھا جن کے بارے میں احتیاطیں ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت تھی۔

۵۸ھ یہ عام حکم ہے جس کے مخاطب آقا بھی ہیں، عام مسلمان بھی اور اسلامی حکومت بھی۔

آقاؤں کو ہدایت ہے کہ مالِ کتابت میں سے کچھ نہ کچھ معاف کر دو۔ چنانچہ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ صحابۂ کرام اپنے مکاتبوں کو مالِ کتابت کا ایک معتد بہ حصہ معاف کر دیا کرتے تھے، حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے تو ہمیشہ ¼ حصہ معاف کیا ہے اور اسی کی تلقین فرمائی ہے۔ (ابن جریر)

عام مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ جو مکاتب بھی اپنا مالِ کتابت ادا کرنے کے لیے ان سے مدد کی درخواست کرے،

وہ دل کھول کر اس کی امداد کریں۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک فی الرقاب بھی ہے، یعنی گردنوں کو بندِ غلامی سے رہا کرانا" (سورۂ توبہ، رکوع ۸) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک فکُّ رقبۃٍ "گردن کا بند کھولنا" ایک بڑی نیکی کا کام ہے (سورۂ بلد)۔ حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے وہ عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے۔ حضورؐ نے فرمایا "تو نے بڑے مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات پوچھ ڈالی۔ غلام آزاد کر، غلاموں کو آزادی حاصل کرنے میں مدد دے، کسی کو جانور دے تو خوب دودھ دینے والا دے، اور تیرا جو رشتہ دار تیرے ساتھ ظلم سے پیش آئے اس کے ساتھ نیکی کر۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو بھوکے کو کھانا کھلا، پیاسے کو پانی پلا، بھلائی کی تلقین کر، برائی سے منع کر۔ اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اپنی زبان کو روک کر رکھ، کھلے تو بھلائی کے لیے کھلے ورنہ بند رہے" (بیہقی فی شعب الایمان عن البراء بن عازب) اسلامی حکومت کو بھی ہدایت ہے کہ بیت المال میں جو زکوٰۃ جمع ہو اس میں مکاتَب غلاموں کی رہائی کے لیے ایک حصہ خرچ کریں۔

اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قدیم زمانے میں غلام تین طرح کے تھے۔ ایک، جنگی قیدی۔ دوسرے آزاد آدمی جن کو پکڑ پکڑ کر غلام بنایا اور بیچ ڈالا جاتا تھا۔ تیسرے وہ جو نسلوں سے غلام چلے آ رہے تھے اور کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کے آباء و اجداد کب غلام بنائے گئے تھے اور دونوں قسموں میں سے کس قسم کے غلام تھے۔ اسلام جب آیا تو عرب اور بیرونِ عرب دنیا بھر کا معاشرہ اِن تمام اقسام کے غلاموں سے بھرا ہوا تھا اور سارا معاشی و معاشرتی نظام مزدوروں اور نوکروں سے زیادہ اِن غلاموں کے سہارے چل رہا تھا۔ اسلام کے سامنے پہلا سوال یہ تھا کہ یہ غلام جو پہلے سے چلے آ رہے ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ اور دوسرا سوال یہ تھا کہ آئندہ کے لیے غلامی کے مسئلے کا کیا حل ہے۔ پہلے سوال کے جواب میں اسلام نے یہ نہیں کیا کہ یکلخت قدیم زمانے کے تمام غلاموں پر سے لوگوں کے حقوقِ ملکیت ساقط کر دیتا، کیونکہ اس سے نہ صرف یہ کہ پورا معاشرتی و معاشی نظام مفلوج ہو جاتا، بلکہ عرب کو امریکہ کی خانہ جنگی سے بدرجہا زیادہ سخت تباہ کن خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑتا اور پھر بھی اصل مسئلہ حل نہ ہوتا جس طرح امریکہ میں حل نہ ہو سکا اور سیاہ فام لوگوں (NERGROS) کی ذلت کا مسئلہ بہرحال باقی رہ گیا۔ اِس احمقانہ طریقِ اصلاح کو چھوڑ کر اسلام نے فکِّ رقبہ کی ایک زبردست اخلاقی تحریک شروع کی اور تلقین و ترغیبِ مذہبی

احکام اور ملکی قوانین کے ذریعہ سے لوگوں کو اس بات پر اُبھارا کہ یا تو آخرت کی نجات کے لیے طوعاً غلاموں کو آزاد کر دیں یا اپنے قصوروں کے کفارے ادا کرنے کے لیے مذہبی احکام کے تحت انہیں رہا کریں، یا مالی معاوضے کر چھوڑ دیں۔ اس تحریک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ۶۳ غلام آزاد کیے۔ آپ کی بیویوں میں سے صرف ایک بیوی حضرت عائشہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ تھی۔ حضور کے چچا حضرت عباس نے اپنی زندگی میں ۷۰ غلاموں کو آزاد کیا۔ حکیم بن حزام نے ۱۰۰، عبداللہ بن عمر نے ایک ہزار، ذوالکلاع حمیری نے آٹھ ہزار، اور عبدالرحمٰن بن عوف نے تیس ہزار کو رہائی بخشی۔ ایسے ہی واقعات دوسرے صحابہ کی زندگی میں بھی ملتے ہیں جن میں حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کے نام بہت ممتاز ہیں۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ایک عام شوق تھا جس کی بدولت لوگ کثرت سے خود اپنے غلام بھی آزاد کرتے تھے اور دوسروں سے بھی غلام خرید خرید کر آزاد کرتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح جہاں تک پہلے کے غلاموں کا تعلق ہے، وہ خلفائے راشدین کا دور ختم ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب کے سب رہا ہو چکے تھے۔ اب رہ گیا آئندہ کا مسئلہ۔ اس کے لیے اسلام نے غلامی کی اس شکل کو تو قطعی حرام اور قانوناً مسدود کر دیا کہ کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر غلام بنایا اور بیچا اور خریدا جائے۔ البتہ جنگی قیدیوں کو صرف اس صورت میں غلام بنا کر رکھنے کی اجازت (حکم نہیں بلکہ اجازت) دی جبکہ اُن کی حکومت ہمارے جنگی قیدیوں سے تبادلہ کرنے پر راضی نہ ہو، اور وہ خود بھی اپنا فدیہ ادا نہ کریں۔ پھر ان غلاموں کے لیے ایک طرف اس امر کا موقع کھلا رکھا گیا کہ وہ اپنے مالکوں سے مکاتبت کر کے رہائی حاصل کر لیں اور دوسری طرف وہ تمام ہدایات ان کے حق میں موجود رہیں جو قدیم غلاموں کے بارے میں تھیں کہ نیکی کا کام سمجھ کر رضائے الٰہی کے لیے انہیں آزاد کیا جائے، یا گناہوں کے کفارے میں ان کو آزادی بخش دی جائے، یا کوئی شخص اپنی زندگی تک اپنے غلام کو غلام رکھے اور بعد کے لیے وصیت کر دے کہ اُس کے مرتے ہی وہ آزاد ہو جائے گا (جسے اسلامی فقہ کی اصطلاح میں تدبیر اور ایسے غلام کو مدبّر کہتے ہیں)، یا کوئی شخص اپنی لونڈی سے تمتع کرے اور اس کے ہاں اولاد ہو جائے، اس صورت میں مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی خواہ مالک نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو — یہ حل ہے جو اسلام نے غلامی کے مسئلے کا کیا ہے۔ جاہل معترضین اس کو سمجھے بغیر اعتراضات جڑتے ہیں، اور معذرت پیشہ حضرات اس کی معذرتیں پیش کرتے کرتے آخر کار اس امر واقعہ ہی کا انکار کر بیٹھتے ہیں کہ اسلام نے

اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہوں [59]، اور جو کوئی مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے۔

غلامی کو کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھا تھا۔

[59] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر لونڈیاں خود پاک دامن نہ رہنا چاہتی ہوں تو ان کو قحبہ گری پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لونڈی خود اپنی مرضی سے بدکاری کی مرتکب ہو تو وہ اپنے جرم کی آپ ذمہ دار ہے، قانون اس کے جرم پر اسی کو پکڑیگا، لیکن اگر اس کا مالک جبر کر کے اس سے یہ پیشہ کرائے تو ذمہ داری مالک کی ہے اور وہی پکڑا جائیگا۔ اور ظاہر ہے کہ جبر کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جبکہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور کیا جائے۔ رہا "دنیوی فائدوں کی خاطر" کا فقرہ، تو دراصل یہ ثبوتِ حکم کے لیے شرط اور قید کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے کہ اگر مالک اس کی کمائی نہ کھا رہا ہو تو لونڈی کو قحبہ گری پر مجبور کرنے میں وہ مجرم نہ ہو، بلکہ اس سے مقصود اس کمائی کو بھی حرمت کے حکم میں شامل کرنا ہے جو اس ناجائز جبر کے ذریعہ حاصل کی گئی ہو۔

لیکن اس حکم کا پورا مقصد محض اس کے الفاظ اور سیاق و سباق سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان حالات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں یہ نازل ہوا ہے۔ اُس وقت عرب میں قحبہ گری کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک خانگی کا پیشہ۔ دوسرے باقاعدہ چکلہ۔ "خانگی" کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا، یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا۔ یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ ان کو مدد خرچ دینگے اور اپنی حاجت پوری کرتے رہیں گے۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت ان مردوں میں سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اس کا ہے اُسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلّم ادارہ تھا جسے اہلِ جاہلیت ایک قسم کا "نکاح" سمجھتے تھے۔ اسلام نے آ کر نکاح کے صرف اس معروف طریقے کو قانونی نکاح قرار دیا جس میں ایک عورت کا صرف ایک شوہر ہوتا ہے اور اس طرح باقی تمام صورتیں زنا میں شمار ہو کر آپ سے آپ جرم ہو گئیں (ابوداؤد، باب فی وجوہ النکاح التی کان یتناکح بہا اہل الجاہلیۃ

دوسری صورت، یعنی کھلی قحبہ گری، تمام تر لونڈیوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان لونڈیوں پر ایک بھاری رقم عائد کر دیتے تھے کہ ہر مہینے اتنا کما کر ہمیں دیا کرو، اور وہ بے چاریاں بدکاری کرا کرا کر یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں۔ اس کے سوا نہ کسی دوسرے ذریعہ سے وہ اتنا کما سکتی تھیں، نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعہ سے یہ رقم لایا کرتی ہیں، اور نہ جوان لونڈیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کئی کئی گنی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ ہی ہو سکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے تھے جنہیں دیکھ کر دُور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ "حاجتمند" آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں "قلیقیات" کہلاتی تھیں اور ان کے گھر "مواخیر" کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے معزز رئیسوں نے اس طرح کے چکلے کھول رکھے تھے۔ خود عبداللہ بن اُبَی رئیس المنافقین: وہی صاحب جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانا طے کر چکے تھے، اور وہی صاحب جو حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے، مدینے میں ان کا ایک باقاعدہ چکلہ موجود تھا جس میں چھ خوبصورت لونڈیاں رکھی گئی تھیں، اُن کے ذریعہ سے وہ صرف دولت ہی نہیں کماتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی تواضع بھی انہی سے فرمایا کرتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد سے اپنے خدم و حشم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔ انہی لونڈیوں میں سے ایک، جس کا نام مُعاذہ تھا، مسلمان ہو گئی اور اس نے توبہ کرنی چاہی۔ ابن اُبَی نے اس پر تشدد کیا۔ اس نے جا کر حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے معاملہ سرکارؐ تک پہنچایا۔ اور سرکار رسالت مآب نے حکم دے دیا کہ لونڈی اس ظالم کے قبضے سے نکال لی جائے (ابن جریر ج ۱۸، ص ۵۵ تا ۵۸ ـ ۱۰۳ ـ ۱۰۴ ـ الاستیعاب لابن عبدالبر ج ۴، ۲۰۲ ۷۶ ـ ابن کثیر ج ۳، ص ۲۸۸ ـ ۲۸۹)۔

یہی زمانہ تھا جب بارگاہِ خداوندی سے یہ آیت نازل ہوئی۔ اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل مقصود لونڈیوں کو جرمِ زنا پر مجبور کرنے سے روکنا نہیں ہے بلکہ دولتِ اسلامیہ کے حدود میں قحبہ گری (PROSTITUTION) کے کاروبار کو بالکل خلافِ قانون قرار دے دینا ہے اور ساتھ ساتھ ان عورتوں کے لیے اعلانِ معافی بھی ہے جو اس کاروبار میں جبراً استعمال کی گئی ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمان آجانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمادیا کہ لا مُساعاۃ فی الاسلام "اسلام میں قحبہ گری کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے" (ابوداؤد بروایت ابن عباس. باب فی ادعاء ولد الزنا)۔ دوسرا حکم جو آپ نے دیا وہ یہ تھا کہ زنا کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام، ناپاک اور قطعی ممنوع ہے۔ رافع بن خدیج کی روایت ہے کہ آپ نے مہر البغی یعنی زنا کے معاوضے کو خبیث اور شر المکاسب، ناپاک اور بدترین آمدنی قرار دیا (ابوداؤد، ترمذی، احمد، نسائی)۔ ابو جُحَیفہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے کسب البغی یعنی پیشۂ زنا سے کمائی ہوئی آمدنی کو حرام ٹھیرایا (بخاری، مسلم، احمد)۔ ابو مسعود عُقبہ بن عمر کی روایت ہے کہ آپ نے مہر البغی کا لین دین ممنوع کر دیا (صحاح ستہ و احمد)۔ تیسرا حکم آپ نے یہ دیا کہ لونڈی سے جائز طور پر صرف ہاتھ پاؤں کی خدمت لی جاسکتی ہے اور مالک کوئی ایسی رقم اُس پر عائد، یا اس سے وصول نہیں کرسکتا جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ یہ رقم وہ کہاں سے اور کیا کرکے لاتی ہے۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ نھیٰ رسول اللہ علیہ وسلم عن کسب الامۃ حتیٰ یُعلم من این ھو۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈی سے کوئی آمدنی وصول کرنا ممنوع قرار دیا جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ آمدنی اُسے کہاں سے حاصل ہوتی ہے" (ابوداؤد، کتاب الاجارہ)۔ رافع بن رفاعہ انصاری کی روایت میں اس سے زیادہ واضح حکم ہے کہ نہانا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کسب الامۃ الا ما عملت بیدھا وقال ھکذا باصابعہ نحو الخبز والغزل والنفش۔ "اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو لونڈی کی کمائی سے منع کیا بجز اس کے جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے، اور آپ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں، جیسے روٹی پکانا، سوت کاتنا، یا اُون اور روئی دھننا" (مسند احمد۔ ابوداؤد، کتاب الاجارہ)۔ اسی معنی میں ایک روایت ابوداؤد اور مسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مروی ہے جس میں کسب الاماء (لونڈیوں کی کمائی) اور مہر البغی (زنا کی آمدنی) وصول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اس آیت کے منشا کے مطابق قحبہ گری کی اُن تمام صورتوں کو مذہبًا ناجائز اور قانونًا ممنوع قرار دے دیا جو اُس وقت عرب میں رائج تھیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، عبداللہ بن اُبی کی لونڈی معاذہ کے معاملہ میں جو کچھ آپ نے فیصلہ فرمایا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس لونڈی سے اُس کا مالک جبرًا پیشہ کرائے اُس پر سے

ہم نے صاف صاف ہدایت دینے والی آیات تمہارے پاس بھیج دی ہیں، اور ان قوموں کی عبرتناک مثالیں بھی ہم تمہارے سامنے پیش کر چکے ہیں جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں، اور وہ نصیحتیں ہم نے کر دی ہیں جو ڈرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں۔[۶۱] ع

اللہ[۶۲] آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔[۶۳] (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک

مالک کی ملکیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ امام زُہری کی روایت ہے جسے ابن کثیر نے مُسنَد عبدالرزاق کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

[۶۱] اس آیت کا تعلق صرف اوپر کی آخری آیت ہی سے نہیں ہے بلکہ اُس پورے سلسلۂ بیان سے ہے جو آغازِ سورہ سے یہاں تک چلا آ رہا ہے۔ صاف صاف ہدایتیں دینے والی آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں زنا اور قذف اور لعان کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ بدکار مردوں اور عورتوں سے اہلِ ایمان کو شادی بیاہ کے معاملہ میں مقاطعہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، شریف لوگوں پر بے بنیاد تہمتیں لگانے اور معاشرے میں فواحش کی اشاعت کرنے سے روکا گیا ہے، مردوں اور عورتوں کو غضِّ بصر اور حفظِ فروج کی تاکید کی گئی ہے، عورتوں کے لیے پردے کے حدود قائم کیے گئے ہیں، شادی کے قابل لوگوں کے مجرد بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے، غلاموں کی آزادی کے لیے کتابت کی صورت تجویز کی گئی ہے، اور معاشرے کو قحبہ گری کی لعنت سے پاک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان ارشادات کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے ڈر کر سیدھی راہ اختیار کر لینے والوں کو جس طرح تعلیم دی جاتی ہے وہ تو ہم نے دے دی ہے، اب اگر تم اس تعلیم کے خلاف چلو گے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم اُن قوموں کا سا انجام دیکھنا چاہتے ہو جن کی عبرتناک مثالیں خود اسی قرآن میں ہم تمہارے سامنے پیش کر چکے ہیں ــــ غالباً ایک حکم نامے کے اختتام پر اس سے زیادہ سخت تنبیہ کے الفاظ اور کوئی نہیں ہو سکتے، مگر آفرین ہے اُس قوم پر جو ما شاءاللہ مومن بھی ہو اور اس حکم نامے کی تلاوت بھی کرے اور پھر ایسی سخت تنبیہ کے باوجود اس حکم نامے کی خلاف ورزی بھی کرتی رہے!

[۶۲] یہاں سے روئے سخن منافقین کی طرف پھرتا ہے جو اسلامی معاشرے میں فتنوں پر فتنے اٹھائے

چلے جا رہے تھے اور اسلام، اسلامی تحریک، اور اسلامی ریاست و جماعت کو زک دینے میں اُسی طرح سرگرم تھے جس طرح باہر کے کُھلے کُھلے کافر دشمن سرگرم تھے۔ یہ لوگ ایمان کے مدعی تھے، مسلمانوں میں شامل تھے، مسلمانوں کے ساتھ اور خصوصاً انصار کے ساتھ، رشتہ و برادری کے تعلقات رکھتے تھے، اسی لیے ان کو مسلمانوں میں اپنے فتنے پھیلانے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ اور بعض مخلص مسلمان تک اپنی سادہ لوحی یا کمزوری کی بنا پر ان کے آلۂ کار بھی بن جاتے تھے اور پشت پناہ بھی۔ لیکن درحقیقت ان کی دنیا پرستی نے ان کی آنکھیں اندھی کر رکھی تھیں اور دعوائے ایمان کے باوجود وہ اُس نُور سے بالکل بے بہرہ تھے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت دنیا میں پھیل رہا تھا۔ اس موقع پر ان کو خطاب کیے بغیر ان کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا جا رہا ہے اس سے مقصود تین امور ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کو فہمائش کی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جو بندہ بھی بہکا اور بھٹکا ہوا ہو اس کی تمام شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود اسے آخر وقت تک سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ دوم یہ کہ ایمان اور نفاق کا فرق صاف صاف کھول کر بیان کر دیا جائے تا کہ کسی صاحبِ عقل و خرد انسان کے لیے مسلم معاشرے کے مومن اور منافق افراد کے درمیان تمیز کرنا مشکل نہ رہے، اور اس توضیح و تصریح کے باوجود جو شخص منافقوں کے پھندے میں پھنسے یا ان کی پشتیبانی کرے وہ اپنے اس فعل کا پوری طرح ذمہ دار ہو۔ سوم یہ کہ منافقین کو صاف صاف متنبہ کر دیا جائے کہ اللہ کے جو وعدے اہلِ ایمان کے لیے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کو پہنچتے ہیں جو سچے دل سے ایمان لائیں اور پھر اُس ایمان کے تقاضے پورے کریں۔ یہ وعدے اُن سب لوگوں کے لیے نہیں ہیں جو محض مسلمانوں کی مردم شماری میں شامل ہوں۔ لہٰذا منافقین اور فاسقین کو یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ وہ ان وعدوں میں سے کوئی حصہ پا سکیں گے۔

۶۲ آسمانوں اور زمین کا لفظ قرآن مجید بالعموم "کائنات" کے معنی میں بولتا ہے۔ لہٰذا دوسرے الفاظ میں آیت کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے۔

نور سے مراد وہ چیز ہے جس کی بدولت اشیاء کا ظہور ہوتا ہے، یعنی جو آپ سے آپ ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرے۔ انسان کے ذہن میں نور اور روشنی کا اصل مفہوم یہی ہے۔ کچھ نہ سوجھنے کی

کیفیت کا نام انسان نے اندھیرا اور تاریکی اور ظلمت رکھا ہے، اور اس کے برعکس جب سب کچھ سجھائی دینے لگے اور ہر چیز ظاہر ہو جائے تو آدمی کہتا ہے کہ روشنی ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ "نور" کا استعمال اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے، نہ اس معنی میں کہ معاذ اللہ وہ کوئی شعاع ہے جو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور ہماری آنکھ کے پردے پر پڑ کر دماغ کے مرکز بینائی کو متأثر کرتی ہے۔ روشنی کی یہ مخصوص کیفیت اُس معنی کی حقیقت میں شامل نہیں ہے جس کے لیے انسانی ذہن نے یہ لفظ اختراع کیا ہے، بلکہ اُس پر اِس لفظ کا اطلاق ہم اُن روشنیوں کے لحاظ سے کرتے ہیں جو اس مادی دنیا کے اندر ہمارے تجربے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے انسانی زبان کے جتنے الفاظ بھی بولے جاتے ہیں وہ اپنے اصل بنیادی مفہوم کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں نہ کہ اُن کے مادی مدلولات کے اعتبار سے۔ مثلاً ہم اس کے لیے دیکھنے کا لفظ بولتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان اور حیوان کی طرح آنکھ نامی ایک عضو کے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔ ہم اس کے لیے سننے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ہماری طرح کانوں کے ذریعہ سے سُنتا ہے۔ اس کے لیے ہم پکڑ اور گرفت کے الفاظ بولتے ہیں۔ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ ہاتھ نام کے ایک آلہ سے پکڑتا ہے۔ یہ سب الفاظ اُس کے لیے ہمیشہ ایک اطلاقی شان میں بولے جاتے ہیں اور صرف ایک کم عقل آدمی ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ سماعت اور بینائی اور گرفت کی کوئی دوسری صورت اُس محدود اور مخصوص قسم کی سماعت و بینائی اور گرفت کے سوا ہونی غیر ممکن ہے جو ہمارے تجربے میں آتی ہے۔ اسی طرح "نور" کے متعلق بھی یہ خیال کرنا محض ایک تنگ خیالی ہے کہ اس کے معنی کا مصداق صرف اُس شعاع ہی کی صورت میں پایا جا سکتا ہے جو کسی چمکنے والے جرم سے نکل کر آنکھ کے پردے پر منعکس ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کا مصداق اس محدود معنی میں نہیں ہے بلکہ مطلق معنی میں ہے، یعنی اِس کائنات میں وہی ایک "اصل سببِ ظہور" ہے، باقی یہاں تاریکی اور ظلمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری روشنی دینے والی چیزیں بھی اُسی کی بخشی ہوئی روشنی سے روشن اور روشن گر ہیں، ورنہ ان کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جس سے وہ یہ کرشمہ دکھا سکیں۔

نور کا لفظ علم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس کے برعکس جہل کو تاریکی اور ظلمت سے تعبیر کیا

طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک[63] درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی[64] جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں[65])۔ اللہ اپنے نور کی طرف

جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معنی میں بھی کائنات کا نور ہے کہ یہاں حقائق کا علم اور راہِ راست کا علم اگر مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔ اس سے فیض حاصل کیے بغیر جہالت کی تاریکی اور نتیجۃً ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے۔

[63] مبارک، یعنی کثیر المنافع، بہت سے فائدوں کا حامل۔

[64] یعنی جو کھلے میدان میں یا اونچی جگہ واقع ہو، جہاں صبح سے شام تک اُس پر دھوپ پڑتی ہو۔ کسی آڑ میں نہ ہو کہ اس پر صرف صبح کی یا صرف شام کی دھوپ پڑے۔ زیتون کے ایسے درخت کا تیل زیادہ لطیف ہوتا ہے اور زیادہ تیز روشنی دیتا ہے۔ محض شرقی یا محض غربی رُخ کے درخت نسبۃً غلیظ تیل دیتے ہیں اور چراغ میں ان کی روشنی ہلکی رہتی ہے۔

[65] اس تمثیل میں چراغ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو اور طاق سے کائنات کو تشبیہ دی گئی ہے، اور فانوس سے مراد وہ پردہ ہے جس میں حضرتِ حق نے اپنے آپ کو نگاہِ خلق سے چھپا رکھا ہے۔ گویا یہ پردہ فی الحقیقت خفا کا نہیں، شدتِ ظہور کا پردہ ہے۔ نگاہِ خلق جو اُس کو دیکھنے سے عاجز ہے اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ درمیان میں تاریکی حائل ہے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ درمیان کا پردہ شفاف ہے اور اس شفاف پردے سے گزر کر آنے والا نور ایسا شدید اور بسیط اور محیط ہے کہ محدود طاقت رکھنے والی بینائیاں اس کا ادراک کرنے سے عاجز رہ گئی ہیں۔ یہ کمزور بینائیاں صرف اُن محدود روشنیوں کا ادراک کر سکتی ہیں جن کے اندر کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے، جو کبھی زائل ہوتی ہیں اور کبھی پیدا ہو جاتی ہیں، جن کے مقابلے میں کوئی تاریکی موجود ہوتی ہے اور اپنی ضد کے سامنے آ کر وہ نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن نورِ مطلق جس کا کوئی مدِ مقابل نہیں، جو کبھی زائل نہیں ہوتا، جو سدا ایک ہی شان سے ہر طرف چھایا رہتا

ہے، اس کا ادراک ان کے بس سے باہر ہے۔

رہا یہ مضمون کہ "چراغ ایک ایسے درختِ زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی" تو یہ صرف چراغ کی روشنی کے کمال اور اس کی شدت کا تصور دلانے کے لیے ہے۔ قدیم زمانے میں زیادہ سے زیادہ روشنی روغنِ زیتون کے چراغوں سے حاصل کی جاتی تھی، اور ان میں روشن ترین چراغ وہ ہوتا تھا جو بلند اور کھلی جگہ کے درخت سے نکالے ہوئے تیل کا ہو۔ تمثیل میں اس مضمون کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اللہ کی ذات، جسے چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے، کسی اور چیز سے طاقت (ENERGY) حاصل کر رہی ہے، بلکہ مقصود یہ کہنا ہے کہ مثال میں معمولی چراغ نہیں بلکہ اس روشن ترین چراغ کا تصور کرو جو تمہارے مشاہدے میں آتا ہے۔ جس طرح ایسا چراغ سارے مکان کو جگمگا دیتا ہے اسی طرح اللہ کی ذات نے ساری کائنات کو بقعۂ نور بنا رکھا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ "اس کا تیل آپ سے آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے"، اس سے بھی چراغ کی روشنی کے زیادہ سے زیادہ تیز ہونے کا تصور دلانا مقصود ہے۔ یعنی مثال میں اس انتہائی تیز روشنی کے چراغ کا تصور کرو جس میں ایسا لطیف اور ایسا سخت اشتعال پذیر تیل پڑا ہوا ہو۔ یہ تینوں چیزیں، یعنی زیتون، اور اس کا غیر شرقی و غربی ہونا، اور اس کے تیل کا آگ لگے بغیر ہی آپ سے آپ بھڑکا پڑنا، مستقل اجزائے تمثیل نہیں ہیں بلکہ پہلے جزءِ تمثیل، چراغ کے ضمنی متعلقات ہیں۔ اصل اجزائے تمثیل تین ہیں، چراغ، طاق، اور فانوسِ شفاف۔

آیت کا یہ فقرہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ "اس کے نور کی مثال ایسی ہے"۔ اس سے وہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے جو کسی شخص کو "اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے" کے الفاظ سے ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کو "نور" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ اس کی حقیقت ہی بس "نور" ہونا ہے۔ حقیقت میں تو وہ ایک ذاتِ کامل و اکمل ہے جو صاحبِ علم، صاحبِ قدرت، صاحبِ حکمت وغیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نور بھی ہے لیکن خود اس کو نور محض اس کے کمالِ نورانیت کی وجہ سے کہا گیا ہے جیسے کسی کے کمالِ فیاضی کا حال بیان کرنے کے لیے اس کو خود فیض کہہ دیا جائے، یا اس کے کمالِ خوبصورتی کا وصف بیان کرنے کے لیے

جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے[66]، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے[67]۔ (اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دے دیا ہے[68]۔ اُن میں ایسے لوگ صبح و شام

خود اسی کو حسن کے لفظ سے تعبیر کر دیا جائے۔

[66] یعنی اگرچہ اللہ کا یہ نورِ مطلق سارے جہان کو منور کر رہا ہے، مگر اس کا ادراک ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے ادراک کی توفیق، اور اس کے فیض سے مستفیض ہونے کی نعمت اللہ ہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ ورنہ جس طرح اندھے کے لیے دن اور رات برابر ہیں، اسی طرح بے بصیرت انسان کے لیے بجلی اور سورج اور چاند اور تاروں کی روشنی چاہے روشنی ہو مگر اللہ کا نور اس کو سجھائی نہیں دیتا۔ اس پہلو سے اس بدنصیب کے لیے کائنات میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ آنکھوں کا اندھا اپنے پاس کی چیز نہیں دیکھ سکتا، یہاں تک کہ جب اس سے ٹکرا کر چوٹ کھا جاتا ہے تب اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ چیز یہاں موجود تھی۔ اسی طرح بصیرت کا اندھا اُن حقیقتوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا جو عین اُس کے پہلو میں اللہ کے نور سے جگمگا رہی ہوں۔ اُسے ان کا پتہ صرف اُس وقت چلتا ہے جب وہ ان سے ٹکرا کر اپنی شامت میں گرفتار ہو چکا ہوتا ہے۔

[67] اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جانتا ہے کس حقیقت کو کس مثال سے بہترین طریقہ پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ جانتا ہے کون اس نعمت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔ جو شخص نورِ حق کا طالب ہی نہ ہو اور ہمہ تن اپنی دنیوی اغراض ہی میں گُم اور مادّی لذتوں اور منفعتوں ہی کی جستجو میں منہمک ہو، اُسے زبردستی نورِ حق دکھانے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اِس عطیّے کا مستحق تو وہی ہے جسے اللہ جانتا ہے کہ وہ اس کا طالب اور مخلص طالب ہے۔

[68] بعض مفسّرین نے ان "گھروں" سے مراد مساجد لی ہیں، اور ان کو بلند کرنے سے مراد ان کو تعمیر کرنا اور ان کی تعظیم و تکریم کرنا لیا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسّرین ان سے مراد اہلِ ایمان کے گھر لیتے ہیں اور انہیں بلند کرنے کا مطلب ان کے نزدیک انہیں اخلاقی حیثیت سے بلند کرنا ہے۔ "اُن میں اپنے نام

اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اُلٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آجائے گی، (اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا اُن کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔[69]

کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے" یہ الفاظ بظاہر مسجد والی تفسیر کے زیادہ مؤید نظر آتے ہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری تفسیر کے بھی اتنے ہی مؤید ہیں جتنے پہلی تفسیر کے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی شریعت کہانت زدہ مذاہب کی طرح عبادت کو صرف معبد ملک تک ہی محدود نہیں رکھتی، جہاں کاہن یا پجاری طبقے کے کسی فرد کی پیشوائی کے بغیر مراسم بندگی ادا نہیں کیے جا سکتے، بلکہ یہاں مسجد کی طرح گھر بھی عبادت گاہ ہے اور ہر شخص اپنا پروہت آپ ہے۔ چونکہ اس سورے میں تمام تر خانگی زندگی کو اعلیٰ و ارفع بنانے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں، اس لیے دوسری تفسیر ہم کو موقع و محل کے لحاظ سے زیادہ لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اگرچہ پہلی تفسیر کو بھی رد کر دینے کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر اس سے مراد مومنوں کے گھر اور ان کی مسجدیں، دونوں ہی ہوں۔

[69] یہاں اُن صفات کی تشریح کر دی گئی جو اللہ کے نورِ مطلق کا ادراک کرنے اور اس کے فیض سے بہرہ مند ہونے کے لیے درکار ہیں۔ اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے کہ یونہی جسے چاہا مالا مال کر دیا اور جسے چاہا دھتکار دیا۔ وہ جسے دیتا ہے کچھ دیکھ کر ہی دیتا ہے، اور نعمتِ حق دینے کے معاملے میں جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اُس کی محبت، اور اُس سے دلچسپی، اور اُس کا خوف، اور اُس کے انعام کی طلب، اور اس کے غضب سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔ وہ دنیا پرستی میں گم نہیں ہے بلکہ ساری مصروفیتوں کے باوجود اُس کے دل میں اپنے خدا کی یاد بسی رہتی ہے۔ وہ پستیوں میں پڑا نہیں رہنا چاہتا بلکہ اُس بلندی کو عملاً اختیار کرتا ہے جس کی طرف اُس کا مالک اس کی رہنمائی کرے۔ وہ اسی حیاتِ چند روزہ کے فائدوں کا طلبگار نہیں ہے بلکہ اس کی نگاہ آخرت کی ابدی زندگی پر جمی ہوئی ہے یہی کچھ دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آدمی کو اللہ کے نور سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق بخشی جائے۔ پھر جب

(اس کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا[۵۹] اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا، بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا، جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا، اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔[۶۰] یا پھر اس کی

اللہ دینے پر آتا ہے تو اتنا دیتا ہے کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو تو دوسری بات ہے، ورنہ اس کی دین کے لیے کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

[۵۹] یعنی اُس تعلیمِ حق کو بصدقِ دل قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اللہ کی طرف سے اس کے پیغمبر دیں، اور جو اس وقت اللہ کے پیغمبر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ اوپر کی آیات خود بتا رہی ہیں کہ اللہ کا نور پانے والوں سے مراد سچے اور صالح مومن ہیں۔ اس لیے اب ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی حالت بتائی جا رہی ہے جو اس نور کو پانے کے اصلی اور واحد ذریعے، یعنی رسول ہی کو ماننے اور اس کا اتباع کرنے سے انکار کر دیں، خواہ دل سے انکار کریں اور محض زبان سے اقراری ہوں، یا دل اور زبان دونوں ہی سے انکاری ہوں۔

[۶۰] اس مثال میں ان لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو کفر و نفاق کے باوجود بظاہر کچھ نیک اعمال بھی کرتے ہوں اور فی الجملہ آخرت کے بھی قائل ہوں، اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہوں کہ ایمانِ صادق، اور صفاتِ اہلِ ایمان، اور اطاعت و اتباعِ رسول کے بغیر ان کے یہ اعمال آخرت میں ان کے لیے کچھ مفید ہوں گے۔ مثال کے پیرایے میں ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم اپنے جن ظاہری و نمائشی اعمالِ خیر سے آخرت میں فائدے کی امید رکھتے ہو ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ ریگستان میں چمکتی ہوئی ریت کو دُور سے دیکھ کر جس طرح پیاسا یہ سمجھتا ہے کہ پانی کا ایک تالاب موجیں مار رہا ہے اور مُنہ اٹھائے اس کی طرف پیاس بجھانے کی امید لیے ہوئے دوڑتا چلا جاتا ہے، اسی طرح تم ان اعمال کے جھوٹے بھروسے پر موت کی منزل کا سفر طے کرتے چلے جا رہے ہو۔ مگر جس طرح سراب کی طرف دوڑنے والا جب اس جگہ پہنچتا ہے جہاں اسے تالاب نظر آ رہا تھا تو کچھ نہیں پاتا، اسی طرح جب تم منزلِ موت میں داخل ہو جاؤ گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ یہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس کا تم کوئی فائدہ اٹھا سکو، بلکہ اس کے برعکس اللہ تمہارے

مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر کا اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اُس پر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے [۲۳] جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں [۲۴] ع

کیا [۲۵] تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ

کفر و نفاق کا، اور اُن بداعمالیوں کا جو تم اُن نمائشی نیکیوں کے ساتھ کر رہے تھے، حساب لینے اور پورا پورا بدلہ دینے کے لیے موجود ہے۔

[۲۳] اس مثال میں تمام کفار و منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے جن میں نمائشی نیکیاں کرنے والے بھی شامل ہیں۔ ان سب کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی قطعی اور کامل جہالت کی حالت میں بسر کر رہے ہیں، خواہ وہ دنیا کی اصطلاحوں میں علامۂ دہر اور علوم و فنون کے استاذ الاساتذہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی جگہ پھنسا ہوا ہو جہاں مکمل تاریکی ہو، روشنی کی ایک کرن تک نہ پہنچ سکتی ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور ماہ رس تفنگے (ROCKETS) بنا لینے کا نام علم ہے۔ اُن کے نزدیک معاشیات اور مالیات اور قانون اور فلسفے میں مہارت کا نام علم ہے۔ مگر حقیقی علم ایک اور چیز ہے، اور اس کی اُن کو ہوا تک نہیں لگی ہے۔ اس علم کے اعتبار سے وہ جاہلِ محض ہیں، اور ایک اَن پڑھ دیہاتی ذی علم ہے اگر وہ معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو۔

[۲۴] یہاں پہنچ کر وہ اصل مدعا کھول دیا گیا ہے جس کی تمہید اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے مضمون سے اٹھائی گئی تھی۔ جب کائنات میں کوئی نور درحقیقت اللہ کے نور کے سوا نہیں ہے، اور سارا ظہورِ حقائق اُسی نور کی بدولت ہو رہا ہے، تو جو شخص اللہ سے نور نہ پائے وہ اگر کامل تاریکی میں مبتلا نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ کہیں اور تو روشنی موجود ہی نہیں ہے کہ اس سے ایک کرن بھی وہ پا سکے۔

[۲۵] اوپر ذکر آ چکا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے مگر اس نور کے ادراک کی توفیق صرف صالح اہلِ ایمان کو نصیب ہوتی ہے، باقی سب لوگ اس نور کامل و شامل کے محیط ہونے ہوئے بھی اندھوں کی طرح تاریکی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اب اس نور کی طرف رہنمائی کرنے والے بے شمار نشانات میں سے

پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے، اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔ اور وہ آسمان سے، اُن پہاڑوں کی بدولت جو اُس میں بلند ہیں[۸۵] اولے برساتا ہے، پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے۔ اُس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ رات اور دن کا اُلٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے۔

اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا، کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ہم نے صاف صاف حقیقت بتانے والی آیات نازل کر دی ہیں، آگے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اللہ ہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، مگر اس کے بعد ان میں

صرف چند کو بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے کہ دل کی آنکھیں کھول کر کوئی انہیں دیکھے تو ہر وقت ہر طرف اللہ کو کام کرتے دیکھ سکتا ہے۔ مگر جو دل کے اندھے ہیں وہ اپنے سر کے دیدے پھاڑ پھاڑ کر بھی دیکھتے ہیں تو انہیں بیولوجی اور زولوجی اور طرح طرح کی دوسری لوجیاں تو اچھی خاصی کام کرتی نظر آتی ہیں مگر اللہ کہیں کام کرتا نظر نہیں آتا۔

۸۵؎ اس سے مراد سردی سے جمے ہوئے بادل بھی ہو سکتے ہیں جنہیں مجازاً آسمان کے پہاڑ کہا گیا ہو۔ اور زمین کے پہاڑ بھی ہو سکتے ہیں جو آسمان میں بلند ہیں، جن کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کے اثر سے بسا اوقات ہوا اتنی سرد ہو جاتی ہے کہ بادلوں میں انجماد پیدا ہونے لگتا ہے اور اولوں کی شکل میں بارش ہونے لگتی ہے۔

سے ایک گروہ (اطاعت سے) مُنہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں[۷۶]۔ جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف، تاکہ رسول ان کے آپس کے مقدمے کا فیصلہ کرے[۷۷] تو ان میں سے ایک فریق کترا جاتا ہے[۷۸]۔ البتہ اگر حق ان کی موافقت میں ہو تو رسول کے پاس بڑے اطاعت کیش بن کر آجاتے ہیں[۷۹]۔ کیا ان کے دلوں کو (منافقت کا) روگ لگا ہُوا ہے؟ یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟ یا ان کو یہ خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کریگا؟ اصل بات یہ ہے کہ ظالم تو یہ لوگ خود ہیں[۸۰]۔ ع

---

[۷۶] یعنی اطاعت سے روگردانی ان کے دعوائے ایمان کی خود تردید کر دیتی ہے، اور اس حرکت سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ انہوں نے جھوٹ کہا جب کہا کہ ہم ایمان لائے اور ہم نے اطاعت قبول کی۔

[۷۷] یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسول کا فیصلہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اُس کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ رسول کی طرف بلایا جانا صرف رسول ہی کی طرف بلایا جانا نہیں بلکہ اللہ اور رسول دونوں کی طرف بلایا جانا ہے۔

[۷۸] واضح رہے کہ یہ معاملہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کے لیے نہ تھا، بلکہ آپ کے بعد جو بھی حکومت اسلامی کے منصبِ قضا پر ہو اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلے کرے اس کی عدالت کا سمن دراصل اللہ اور رسول کی عدالت کا سمن ہے، اور اس سے مُنہ موڑنے والا درحقیقت اُس سے نہیں بلکہ اللہ اور رسول سے مُنہ موڑنے والا ہے۔ اس مضمون کی یہ تشریح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرسَل حدیث میں مروی ہے جسے حسن بصری رحمۃ اللہ نے روایت کیا ہے کہ من دُعِیَ الی حاکم من حکام المسلمین فلم یجب فھو ظالم لاحق لہ۔ "جو شخص مسلمانوں کے حکامِ عدالت میں سے کسی حاکم کی طرف بلایا جائے اور وہ حاضر نہ ہو تو وہ ظالم ہے، اُس کا کوئی حق نہیں ہے" (احکام القرآن جصاص، ج ۳، ص ۴۰۵)۔ بالفاظ دیگر ایسا شخص سزا کا بھی مستحق ہے، اور مزید براں اس کا بھی مستحق ہے کہ اسے برسرِ باطل فرض کر کے اس کے خلاف یکطرفہ فیصلہ دے دیا جائے۔

[۷۹] یہ آیات اس حقیقت کو صاف صاف کھول کر بیان کر رہی ہیں کہ شریعتِ الٰہی کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرنا اور کرانا عین لازمۂ ایمان ہے۔ جو شخص شریعت کی مفید مطلب باتوں کو خوشی سے لپک کر لے لے، مگر جو کچھ خدا کی شریعت میں اس کی اغراض و خواہشات کے خلاف ہو اسے رد کر دے، اور اس کے مقابلے میں دنیا کے

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اسکی نافرمانی سے بچیں۔

دوسرے قوانین کو ترجیح دے وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔ اس کا دعوائے ایمان جھوٹا ہے، کیونکہ وہ ایمان خدا اور رسول پر نہیں، اپنی اغراض اور خواہشات پر رکھتا ہے۔ اس رویتے کے ساتھ خدا کی شریعت کے کسی جزء کو اگر وہ مان بھی رہا ہے تو خدا کی نگاہ میں اس طرح کے ماننے کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔

ن۵۰ یعنی اس طرزِ عمل کی تین ہی وجہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی سرے سے ایمان ہی نہ لایا ہو اور منافقانہ طریقے پر محض دھوکا دینے اور مسلم معاشرے میں شرکت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمان ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ ایمان لے آنے کے باوجود اسے اس امر میں ابھی تک شک ہو کہ رسولِ خدا کا رسول ہے یا نہیں، اور قرآن خدا کی کتاب ہے یا نہیں، اور آخرت واقعی آنے والی ہے بھی یا یہ محض ایک افسانہ تراشیدہ ہے، بلکہ خدا بھی حقیقت میں موجود ہے یا یہ بھی ایک خیال ہے جو کسی مصلحت سے گھڑ لیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ خدا کو خدا اور رسول کو رسول مان کر بھی ان سے ظلم کا اندیشہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ خدا کی کتاب نے فلاں حکم دے کر تو ہمیں مصیبت میں ڈال دیا اور خدا کے رسول کا فلاں ارشاد یا فلاں طریقہ تو ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو ایسے لوگوں کے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس طرح کے خیالات رکھ کر جو شخص مسلمانوں میں شامل ہوتا ہے، ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، اور مسلم معاشرے کا ایک رکن بن کر مختلف قسم کے ناجائز فائدے اس معاشرے سے حاصل کرتا ہے، وہ بہت بڑا دغاباز، خائن اور جعل ساز ہے۔ وہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتا ہے کہ اسے شب و روز کے جھوٹ سے ذلیل ترین خصائل کا پیکر بناتا چلا جاتا ہے۔ اور اُن مسلمانوں پر بھی ظلم کرتا ہے جو اُس کے ظاہری کلمۂ شہادت پر اعتماد کر کے اسے اپنی ملت کا ایک جز مان لیتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ طرح طرح کے معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور اخلاقی تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔

مُحسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم)

(مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے ہوئے)

—— مدنی دَور ——

نعیم صدیقیؒ

—— بسلسلہ گذشتہ ——

تحریک کا نیا مرکز تحریکِ حق کا آسمانی لیڈر برابر اس سوچ میں رہا کہ اگر مکّہ کے ظرف میں سمائی نہیں اور یہاں کی سنگین قیادت "جہانِ نو" کی تاسیس کا موقع دینے پر تیار نہیں ہے تو پھر زمین کا اور کونسا گوشہ ہو سکتا ہے جہاں طاقت کو سمیٹ کر تعمیری کام شروع کیا جا سکے۔ پہلے نگاہ حبش پر گئی اور اسی لیے ساتھیوں کو وہاں بھیجا۔ اگرچہ شاہِ نجاشی نے مظلومینِ مکّہ کی حمایت کا حق ادا کر دیا، لیکن ایک تو وہاں کے عیسائی علماء کا گھٹیا کردار سامنے آ چکا تھا اور ان کے چھائے ہوئے اثر کے تحت دینِ حق کا پنپنا آسان نہ تھا۔ دوسرے وہاں کی مقامی آبادی میں بالکل نئے سرے سے کام کرنے کی ضرورت تھی اور اس میں اجنبیت کے بہت سے وجوہ حائل نظر آتے تھے، اس لیے کسی دوسرے گوشے کی تلاش تھی۔ مدینہ نے جب مکّے دل سے دعوتِ حق کو لبیک کہی تو سرورِ عالم کو امید کی ایک نئی جھلک نظر آئی۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ نے اس امید کو مستحکم تر کر دیا۔ پھر مصعبؓ بن عمیر نے خود وہاں رہ کر اور کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد بیعتِ عقبہ ثانیہ والے موسمِ حج میں حج سے کچھ قبل آ کر حضورؐ کی خدمت میں پوری رپورٹ پیش کی۔ مدینہ کے مسلمانوں کی تفصیل بیان کی، اُن کی قوت کا حال بتایا اور خوش خبری دی کہ وہ امسال بڑی تعداد میں آ رہے ہیں۔ اس رپورٹ نے حضورؐ کو غور و فکر کی دعوت دی۔ یہ صورت فی الواقع بڑی خوش آئند تھی کہ مدینہ کے مسلمان تعداد اور قوت کے لحاظ سے دن دن، رات رات بڑھ رہے تھے اور پھر یہود کی طرف سے اس طرح کی سنگین

مخالفت کا ان کو سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا جیسے ان کے مکی ساتھیوں کو قریش کی طرف سے درپیش تھی۔ اور اہلِ یثرب مکہ والے رفقاء کے لیے بالعموم کڑھتے تھے، ان کو بہت زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، ان کے ہاں کھیتیاں تھیں اور نخلستان اور تاکستان تھے۔ حضورؐ سوچتے تھے کہ کیا یہ اچھا نہ ہو کہ مکہ کے رفقاء مدینہ چلے جائیں اور قریش کے مظالم سے نجات پاکر دین کے تقاضے پورے کریں۔ چنانچہ آنے والے وفد میں جو لوگ محرم تھے ان سے آپؐ نے اس خیال کا اظہار بھی فرما دیا۔ اور بعد میں جس شکل میں پیمان باندھا گیا وہ اسی پس منظر کے ساتھ تھا۔[1]

یوں تو ہجرتِ حبشہ سے مہاجرین کے لوٹ آنے کے بعد ہی سے اکا دکا رفقاء آپؐ کی اجازت سے مدینہ جاتے رہے، لیکن بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے بعد رفتار تیز ہوگئی اور تقریباً طے ہوگیا کہ دوسرا دار الہجرت مدینہ ہی ہوگا۔

سوادِ اہلِ مکہ دیکھ رہے تھے کہ تحریکِ اسلامی نے ایک نیا مضبوط مرکز پیدا کر لیا ہے۔ ان کی نگاہوں میں مستقبل بڑا بھیانک ہو ہو کر آنے لگا۔ وہ اپنی جگہ خوب سمجھ رہے تھے کہ اب اگر مدینہ میں کلمۂ حق کی جڑ لگ جاتی ہے تو ہمارے حدود و اثر سے باہر ہی باہر یہ کلمہ ایک ناقابلِ شکست طاقت بن کر ایک دن ہماری ہی خبر لے گا اور ہمیں کو اپنے کرتوتوں کا حساب پائی پائی ادا کرنا ہوگا۔ وہ اس خطرے کو بھی محسوس کر رہے تھے کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گزرتی ہے اس لیے مدینہ کا نیا اسلامی مرکز شاہراہ کی ناکہ بندی کر سکے گا اور اس طرح ان کی معاشی شاہ رگ کٹ جائے گی۔ ان پر اندر ہی اندر گھبراہٹ کا شدید دورہ پڑ چکا تھا، مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کریں کیا؟ وہ دن رات اس اندیشے میں رہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پوری جماعت کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اسی اندیشے کے زیرِ اثر وہ بالآخر صاحبِ نبوتؐ کے قتل کے منصوبے بنانے پر اتر آئے۔ ایک تاریخی طاقت جو ان کے اپنے گھر سے اُبھری اور ساری دنیا سے زیادہ وہ اُن کی اپنی تھی؛ اسے اپنے ہی کرتوتوں سے "غیر" بنا دیا اور خود اس کے دشمن بن کھڑے ہوئے، پس اب جوں جوں وہ زور پکڑتی تھی ان کے لیے ایک جان لیوا

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ حیاتِ محمد از محمد حسین ہیکل مصری ص ۲۰۲۔

خطرہ بنتی جاتی تھی۔

چنانچہ پہلا مہاجر جب مدینہ کے ارادے سے نکلا تو مکہ والوں نے اس کے ساتھ جفا کارانہ معاملہ کیا۔ یہ اولین مہاجر ابو سلمہ عبداللہ بن الاسد مخزومی تھے۔ یہ بیوی بچے کو اونٹ پر سوار کر کے نکلے۔ ان کی بیوی بنو مغیرہ میں سے تھیں، وہ لوگ عین روانگی کے وقت تندی میں آئے اور ام سلمہؓ کے اونٹ کی مہار یہ کہہ کر ابو سلمہ سے چھین لی کہ اسے ہم تیرے ساتھ در در پھرنے کے لیے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس جذباتی صورت حالات نے ابو سلمہ کے قبیلہ والوں میں سخت ردعمل پیدا کر دیا۔ انہوں نے بنو مغیرہ سے کہا کہ اگر تم ہمارے آدمی سے اس کی جورو کو یوں چھینتے ہو تو پھر ہم اپنا ننھا بچہ اس کی گود میں نہ رہنے دیں گے، چنانچہ شوہر، بیوی اور بچہ تینوں باہم گر بچھڑ گئے اور اس عالم میں ابو سلمہ نے کوچ کیا۔ ام سلمہ نت صبح کو آکر شہر سے باہر اسی موقع پر آکر زار قطار رونے لگتیں۔ آخر سال بھر کے بعد کسی کو رحم آگیا اور اس نے بنو مغیرہ سے کہہ سن کر اونٹ پر سوار کرا کے ام سلمہ کو بچے سمیت مدینہ روانہ کرا دیا اور وہ تن تنہا چل کھڑی ہوئیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک مقام پر عثمان بن طلحہ مل گئے اور انہوں نے اس مہاجرہ کو حوالیٔ مدینہ میں پہنچا دیا۔

یعنی ہجرت حبشہ کے تلخ تجربے کے بعد اب پالیسی یہ ٹھہری کہ خدا پرستانہ نظام زندگی کے علمبرداروں کو اپنے قابو سے نکلتے ہوئے روکا جائے۔ وہ نکلیں تو ایسی حالت میں نکلیں کہ ان کا کنبہ قبیلہ بطور یرغمال مکہ والوں کے پاس رہے۔ یہ پالیسی شروع میں ذرا ڈھیلی ڈھالی تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس میں سختی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور عیاش ابن ابی ربیعہ اور ہشام بن العاصی بن الوائل دور آخر میں ایسے عالم میں چھپ چھپا کر نکلے کہ ہر وقت دھڑکا تھا کہ کہیں گرفتار نہ ہو جائیں۔ حضرت عمر اور عیاش تو تیز رفتاری سے نکل گئے لیکن ہشام کو پکڑ لیا گیا اور وہ شکنجۂ استبداد میں آگئے۔ حضرت عمر اور عیاش بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ مکہ سے ایک سازشی وفد ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ یہ ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ جا کر عیاش سے ملے اور کہا کہ تمہاری والدہ کا حال ابتر ہے اور اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تم سے نہ ملے گی سر کے بال نہ سنوارے گی اور چلچلاتی دھوپ میں کھڑی رہے گی۔

ساتھیوں نے سمجھایا کہ یہ واضح طور پر ایک چال ہے، تم ایک بار مکہ والوں کے پھندے میں پھنس گئے تو یہ تمہیں دین سے ہٹا دیں گے۔ عیاش کو ایک لالچ یہ بھی تھا کہ وہ مالدار آدمی تھے اور کچھ مال نکال لانا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پیش کش کی کہ میں اس سے زیادہ مال رکھتا ہوں اور تم مجھ سے آدھا مال لے لو، ان دونوں کے ساتھ نہ جاؤ۔ عیاشؓ نہ مانے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اچھا اگر یہی طے ہے تو میری اصیل اونٹنی لے جاؤ، جہاں کوئی اندیشہ محسوس ہو، بھاگ نکلنا۔ مگر مکی سازشیوں نے راستے میں ایسی چال چلی کہ اصیل اونٹنی سے فائدہ اٹھانا بھی عیاش کے بس میں نہ رہا اور ان کی مشکیں کس لی گئیں۔ اہل وفد جب مکہ پہنچے تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو، یوں علاج کرو اپنے اپنے عقل کے ماروں کا جیسے ہم نے کیا ہے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے دستِ خاص سے ایک خط ہشام بن العاص کو لکھا اور اس میں مشہور آیت "یعبادی الذین اسرفوا ..... الخ" درج کی۔ اس خط کو مکہ کے پاس "ذی طُویٰ" نامی موقع پر ہشام نے پڑھا، بار بار غور کیا اور عجیب بات پائی کہ اس میں اشارہ خود اس کی جانب ہے تو فوراً اونٹ لیا، کجاوا کسا اور روانہ ہو گیا۔ لیکن اس سے زیادہ مضبوط روایت یہ ہے کہ جب آنحضور صلعم مدینہ تشریف لا چکے تو ایک دن مجلس میں ان دونوں محبوسین کا ذکر چھڑا۔ آپ نے فرمایا "عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن العاص کو نجات دلانے کے لیے کون مجھے اپنی خدمات سونپتا ہے؟" ولید بن مغیرہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ولید حکم نبوی کے مطابق مکہ روانہ ہو گئے۔ چھپتے چھپاتے آبادی کے قریب آئے، ایک عورت کھانا لے جاتی نظر آئی۔ پوچھا "اللہ کی بندی، کدھر کو جا رہی ہو؟" اُس نے جواب دیا کہ "یہاں دو قیدی ہیں، یہ کھانا ان کے لیے ہے۔" ولید پیچھے ہو لیے۔ وہی دونوں تھے اور ایک بے چھت کے مکان میں بند تھے۔ شام ہو گئی تو یہ دیوار پھاند کر اترے۔ ان کی بیڑیوں کے نیچے پتھر رکھ کر اپنی تلوار سے ان کو کاٹ ڈالا۔ پھر باہر نکال کر دونوں کو اونٹ پر بٹھایا اور راہ فرار اختیار کی۔

اسی طرح کثیر لوگ خود اگر نکلے بھی تو مکہ والوں نے ان سے ان کے اموال رکھوا لیے۔ جیسے تجارت سے جانیں بچا کر نکلنے والے بہت سے مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔

لیکن ہجرت کے اس درجہ جگر آزما ہونے کے باوجود مرد ہی نہیں، خواتین بھی برابر جادۂ فرض پر اقدام کررہی تھیں۔ تحریکِ اسلامی کا یہ اعجاز اپنی مثال نہیں رکھتا کہ آج سے صدیوں پہلے کے وحشی عرب کی اَن پڑھ خواتین تک میں اس زندگی بخش طاقت نے ایک زوردار حرکتِ عمل پیدا کردی۔

مہاجرین کے راستے میں رکاوٹیں ڈال کر قریش اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کررہے تھے۔ مگر دوسری طرف جس شخصیت سے سابقہ تھا وہ عالی حوصلگی کی اونچی چوٹی پر کھڑی تھی۔ وہاں سمندر کا سا وسیع ظرف تھا۔ وہ پیکرِ صبر و استقلال ٹھنڈی عزیمت اور ٹھہراؤ والی فطرت سے آراستہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مرکزِ دعوت پر ڈٹا رہا۔ اسے آخری حد تک اتمامِ حجت کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ وہ اہلِ مکہ کے خلاف مشیتِ الٰہی کے کھیل کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنا فرض صبر و تحمل سے ادا کر رہا تھا۔ اس کی مثال ڈوبتے جہاز کے بہادر کپتان کی سی تھی کہ جو سارے عملے اور سارے مسافروں کو سلامتی کی کشتی پر سوار کرنے کے بعد سب سے آخر میں جہاز کو چھوڑنے والا تھا۔

جب بجز ایسے چند افراد کے کوئی باقی نہ رہا جنہیں قریش کے جبر نے محصور کر رکھا تھا یا جن کو کسی مفاد یا مصلحت نے باندھ رکھا تھا تو اس وقت آپؐ کو آسمانی حکومت کی طرف سے پروانۂ ہجرت ملا۔ آپؐ نکلے تو ایسے عالم میں نکلے جبکہ مکّہ والے آپؐ کو زندہ دیکھنے کے روادار نہ رہے تھے۔ اور جب نکلنے کی گھڑی آگئی تو خون کی پیاسی تلواروں کے گھیرے میں سے آپؐ بے خوفی کی شان سے نکل گئے۔

مدینہ — ہمہ تن انتظار | مہاجرین کی تعداد جوں جوں بڑھ رہی تھی مدینہ میں زندگی کی رَو زور پکڑ رہی تھی۔ دعوتِ حق کا اُجالا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور جتنا جتنا اسلام دلوں کی دنیاؤں کو فتح کرتا جاتا تھا اسلام کا پیغام لانے والے محسن کی محبت بڑھتی جاتی تھی۔ خصوصاً بیعتِ عقبہ ثانیہ کے بعد سے مدینہ کی چشمِ انتظار ہردم مکّہ سے آنے والے راستے پر لگی رہنے لگی۔ ایک فصل لہلہا رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ ابرِ کرم آئے اور برس جائے۔ ایک چمن لالہ و گل آراستہ تھا اور امیدوار تھا کہ بادِ بہاری کے جھونکے آئیں اور رنگ و بو کے طوفان اُبل پڑیں۔ سارا مجمع پڑا تھا اور ہمہ تن آرزو تھا کہ معمارِ انسانیت آئے اور تعمیرِ نو برپا کردے۔

ہوا کی لہریں یہ اطلاع بھی کسی نہ کسی طرح لے آئیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل چکے ہیں اور جادۂ ہجرت کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اس خبر پر مدینہ میں اشتیاق کے جذبات اضطراب کی حد کو پہنچ گئے ہونگے۔ انتظار کی بے چینیاں زور پکڑ گئی ہونگی۔ سوچو کہ ہر طرف کیا چرچے ہونگے؟ کیا استفسارات ہوا کرتے ہونگے؟ کیسی گفتگوئیں محفلوں کی رونق رہتی ہونگی؟ جذبات و احساسات کا کیا عالم ہو گا۔ مشرکین کا، یہود کا، انصار کا، مسلمانوں کا؟

چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبانوں پر یہی بات رہنے لگی کہ رسول آ رہے ہیں، رسول آ رہے ہیں۔ لوگ ہر صبح گھروں سے نکلتے اور شہر سے باہر جمع ہو کر انتظار کرتے، جب گرما کا سورج اونچا ہو جاتا اور دھوپ قابلِ برداشت نہ رہتی تو حسرت زدہ ہو کر لوٹ جاتے۔ یومِ قدومت کو بھی لوگ اسی طرح جمع ہو کر لوٹ رہے تھے کہ ایک یہودی نے قلعے پر سے دیکھا اور مژدہ سنایا کہ "اہلِ عرب! لو تمہیں جس بزرگ کا انتظار تھا وہ آ پہنچے"۔ تمام شہر تکبیر کے غلغلے سے گونج اٹھا۔ لوگ بے تابانہ وار دوڑے۔ اکثر انصار خوب ہتھیار لگا لگا کر نکلے۔

اوّلین قیام مقام قبا میں ہوا جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مضافاتی آبادی تھی۔ عمرو بن عوف کے خاندان نے نعرہ ہائے مسرت کے ساتھ استقبال کیا اور اسی خاندان کو شرفِ میزبانی حاصل ہوا۔ یہ گھر دراصل تحریکِ اسلامی کا ایک مرکزی اڈہ (CELL) تھا۔ مہاجرین میں اکثر کے لیے منزلِ اوّل یہی گھر بنا اور بعض مہاجر صحابی اس وقت بھی یہیں مقیم تھے۔ حضرت علیؓ بھی امانتوں کی ادائی کے بعد روانہ ہو کر یہیں کاروانِ محبوب کے ساتھ آ ملے۔ یہاں چودہ روز قیام رہا اور مہاجرین و انصار جوق در جوق شرفِ ملاقات کو آ رہے تھے۔ لوگ اس ہستی کو دیکھنا چاہتے تھے جس کا پیغام ان کے سینوں میں گھر کر چکا تھا۔ اس کے چہرے کی ایک جھلک نگاہوں کے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اس کے منہ سے میٹھے بول سننا چاہتے تھے، اس کی دعائے خیر سے حصہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ غائبانہ عقیدت اب محسنِ انسانیتؐ کو رُو در رُو دیکھنا چاہتی تھی۔ سلام، ملاقاتیں، گفتگوئیں، دعائیں، مجلسیں، کیا کچھ نہ ہو رہا ہو گا۔

قبا میں آپ نے اپنے ہاتھوں سے ایک مسجد کی بنا رکھی۔ ایک ایک مسلمان اس تعمیر کی مہم میں شریک تھا اور خود دنیا کا سب سے بڑا تاریخ ساز ایک معمولی مزدور کی طرح بھاری بھرکم پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا۔ کام ہو رہا تھا اور ساتھ کے ساتھ گیت گایا جا رہا تھا۔

افلح من یعالج المساجدا ویقرء القرآن قائماً وقاعداً

ولا یبیت اللیل عنہ راقداً

یعنی کامیاب وہ ہے جو مسجدیں تعمیر کرے، اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھے اور راتوں کو عبادت کے لیے جاگے۔ یہ مسجد محض اینٹ پتھر اور گارے اور پھونس کا مجموعہ نہ تھی، اس میں خاتم النبیین سے لے کر ایک عامی مسلمان تک ہر ایک نے اپنے بہترین جذبات صرف کیے تھے۔ اسی لیے اس کی شان میں قرآن نے کہا "لمسجد اُسِّسَ علی التقویٰ" - یہ ایسی مسجد ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر استوار کی گئی ہے۔

قبا میں ورود ۸ ربیع الاول سالِ ۱ نبوی (ہجری) بروز جمعرات ہوا تھا۔ چودہ روز بعد انسانِ اعظم نے رفقاء سمیت مدینہ کا رخ کیا۔ قبا سے مدینہ تک دو رویہ انصار خیر مقدم کے لیے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ آپ کے ننھیالی رشتہ داروں نے خاص اشتیاق سے ہتھیار لگائے۔ عورتیں چھتوں پر جمع تھیں اور ترانۂ خیر مقدم گا رہی تھیں۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

اور چھوٹی بچیوں کے غول گھوم رہے تھے، یہ لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی پھرتی تھیں۔

نحن جوار من بنی نجار یا حبذا محمداً من جار

ان بچیوں کی پاکیزہ محبت کا جواب سرورِ عالم نے بھی خاص شفقت سے دیا۔ ان سے باتیں کیں۔ پوچھا کہ "کیا تم مجھے چاہتی ہو؟" انہوں نے کہا "جی ہاں!" آپ نے فرمایا کہ "میں بھی تم کو چاہتا ہوں"[1]

ذرا تصور میں لائیے اس تاریخی گھڑی کو جو مدینے کے نصیب میں آئی تھی۔ گلیوں کی خاک کے ذرے ذرے میں دل دھڑک رہے ہونگے۔ دیواروں کی درزوں کو آنکھیں مل گئی ہونگی۔ ہوا کے جھونکوں میں انسانی احساسات

---

[1] سیرت النبی ج ۱ ص ۲۰۴-۲۰۲۔

پیدا ہو گئے ہونگے۔

عارضی قیام کے لیے حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کی قسمت جاگی۔ سات ماہ نبی اکرم کا قیام یہیں رہا۔

تعمیری اقدامات جونہی ذرا سکون ہوا اور مسافرت کی کیفیت ختم ہوئی تو سرورِ عالم تعمیری اقدامات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اولین مہم مسجد کی تعمیر کی تھی۔ دو یتیم بچوں کی افتادہ زمین خریدی گئی اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ ہی نے قیمت ادا کی۔ اس زمین پر مسجد نبوی کی تاسیس ہوئی۔ مسجد کی اہمیت صرف بطور معبد ہی کے نہ تھی بلکہ اسے اسلامی نظام تمدن و ریاست کا سرچشمہ و مرکز بننا تھا۔ وہ حکومت کا دربار، مشورے کا ایوان، سرکاری مہمان خانہ، جمہوری دارالعلوم اور قومی لکچر ہال کی حیثیت سے برپا کی گئی۔ اس اولین تعمیری اقدام پر وہی قبادالانقشہ پیش آیا۔ کون مسلمان ہوگا جس نے اس میں دل و جان سے حصہ نہ لیا ہوگا۔ خود سرورِ عالم پتھر اور گارا اُٹھا اُٹھا کر لاتے۔ اس منظر کو دیکھ کر ایک مسلمان مارے جذبات کے پکار اُٹھا کہ:

لئن قعدنا والنبیُّ یعملُ   لذاك منّا العمل المضلَّلُ

یعنی اگر خدا کا نبی اس کام میں یوں لگ جائے اور ہم بیٹھے دیکھتے رہیں تو ہمارا کیا کرایا غارت ہوا۔

کام کی گرما گرمی میں کوئی بیہودہ گوئی نہ تھی، بلکہ آنحضورؐ سمیت سب کے سب یہ صدا بلند کر رہے تھے:

لا عیش الا عیش الاٰخرہ   اللّٰھم ارحم الانصار والمھاجرہ

یعنی آخرت کی ابدی زندگی ہی زندگی ہے اور وہ نہ ہو تو پھر زندگی ہیچ ہے۔ اے اللہ! تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔[1]

یہ تھی اسپرٹ اور یہ تھیں دعائیں جو مسجد نبوی کی تعمیر کا اصل مسالہ بنیں۔ مسجد کے ساتھ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گارے اور پھونس کے حجرے (کوارٹرز) تعمیر ہو گئے۔ آپ اپنے انہی کوارٹرز میں منتقل ہو گئے۔

مدینہ میں حضرت رسالت مآب کی تشریف آوری سے از خود دعوت کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور اس سات ماہ کے عرصے میں تحریک حق نے قبیلے قبیلے اور گھر گھر سے جاں نثار حاصل کر لیے۔ صرف خطمہ، واقف، وائل اور امیہ کے گھرانوں میں شرک کی تاریکی باقی رہ گئی، اور ان سب کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔[2]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۴۱-۱۴۲   [2] ایضاً ص ۱۴۶

تعمیری مہم کے سلسلے میں کارِ دعوت کا آگے بڑھانا درجۂ اوّل کی اہمیت رکھتا تھا۔ انفرادی دعوت کے علاوہ سرورِ عالمؐ نے اجتماعی طور سے کام کا آغاز جس خطاب عام سے کیا وہ ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

"حمد و ثنا کے بعد — اے لوگو! اپنی جانوں کے لیے وقت پر کچھ کمائی کر لو، خوب جان لو، خدا کی قسم تم میں سے ہر ایک پر موت وارد ہوگی اور وہ اپنے گلّے کو اس حال میں چھوڑ کر رخصت ہوگا کہ کوئی اس کا چرواہا نہ رہے گا، پھر اسے اس کے پروردگار کی طرف سے ایسے عالم میں خطاب کیا جائیگا جبکہ بیچ میں کوئی ترجمان اور دربان نہ ہوگا۔ کہا جائے گا کہ کیا تجھ تک میرا رسول نہیں پہنچا تھا، جس نے بات تجھ تک پہنچائی ہو؟ پھر کیا میں نے تجھے مال نہیں دیا تھا اور تجھ پر نوازش نہیں کی تھی؟ تو پھر اپنی جان کے لیے تو نے کیا اندوختہ کیا؟ پس وہ دیکھے گا دائیں بائیں، لیکن کچھ نہ دکھائی دیگا۔ پھر سامنے کی طرف نگاہ ڈالے گا، مگر بجز جہنم کے اور کچھ سامنے نہ آئے گا۔ سو جس کسی کو بھی توفیق ہو کہ وہ کھجور کی ایک پھانک کے عوض بھی اپنے چہرے کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لیے کچھ کر سکتا ہو تو کرے۔ جو اتنا بھی نہ کر سکے وہ کوئی بھلی بات کہہ کر ہی بچاؤ کرے۔ کیونکہ نیکی کا بدلہ دس گنا سے لیکر سات سو گنا تک ملتا ہے۔ اور تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں وارد ہوں۔[۱]"

دوسرا خطاب عام جو آپؐ نے فرمایا، یہ تھا۔

"ساری تعریف اللہ کے لیے ہے۔ میں اسی کی حمد کرتا ہوں، اسی سے مدد چاہتا ہوں۔ ہم سب اپنے دلوں کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں کے مقابلے میں اللہ ہی کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ ہدایت سے محروم کردے اس کے لیے کوئی رہنما نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کہ جو ایک ہے اور جس کے ساتھ کوئی دوسرا حصہ دار نہیں، کوئی اور قابل عبادت و طاعت ہستی نہیں۔ بلاشبہ بہترین بیان اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب ہے۔ جس شخص کے دل کے لیے اللہ نے اس کو محبوب بنا دیا اور جسے کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا اور جس نے دوسرے انسانی بیانوں کے مقابلے میں اسے اپنے لیے پسند کر لیا، اس نے فلاح پائی

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۴۶

یہ بہترین بیان ہے اور سب سے زیادہ مؤثر۔ تم وہی کچھ پسند کرو جو اللہ کو پسند ہے اور اللہ سے اخلاص کے ساتھ محبت کرو۔ اللہ کے کلام سے تغافل نہ برتو اور تمہارے دل اس کے لیے سخت نہ ہونے پائیں چونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ جو کچھ پیدا کرتا ہے اس میں سے بہتر کو چھانٹتا اور منتخب کرتا ہے۔ سو اس نے اعمال میں سے بہترین اور بندوں میں سے برگزیدہ ترین اور بیانوں میں سے پاکیزہ ترین کو متعین فرما دیا ہے۔ نیز انسانوں کو جو کچھ دیا گیا ہے اس سب میں سے کچھ حلال ہے، کچھ حرام۔ پس اللہ کی غلامی اختیار کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دو، اُس کے غضب سے اس طرح بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے۔ اور اللہ کے حضور میں وہ سارے پاکیزہ اقوال سچ کر دکھاؤ جن کو تم اپنی زبانوں سے ادا کرتے ہو۔ اور اللہ کی رحمت کے ذریعے ایک دوسرے سے محبت کا رشتہ استوار کرو۔ یقیناً اللہ ناراض ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ باندھے ہوئے (ایمان کے) عہد کو توڑا جائے۔ اور تم پر سلامتی ہو۔"[1]

تقریر کے الفاظ جو روایات سے ملتے ہیں بہت مختصر ہیں اور آنحضور کے خطاب بالعموم مختصر ہوتے تھے۔ لیکن مطالب کی جامعیت دیکھیے کہ وقت کے تمام اہم مسائل ان الفاظ میں بول رہے ہیں۔ تقریر میں اسلام کی دعوت بھی دی گئی ہے، قرآن کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، حلال و حرام کی تمیز پیدا کرنے کا درس دیا گیا ہے اور اصولی و مقصدی جذبۂ اخوت و رفاقت پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ان دو تقریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اجتماعی دعوت کی نئی لہر کس انداز سے اٹھائی گئی تھی۔ ایک طرف بنیادی نظریہ کا پیغام دیا جا رہا تھا اور دوسری طرف اسی نظریہ کی اسپرٹ کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے سوسائٹی کو رہنمائی دی جا رہی تھی۔

اسلامی ریاست کی تاسیس | تیسرا تعمیری اقدام ــــ اور شاید سیاسی لحاظ سے سب سے بڑا تعمیری اقدام ــــ یہ تھا کہ ریاست چلانے کے لیے مدینہ کے یہود و مشرکین اور مسلمانوں کی سوسائٹی کو ایک نظم میں پرو دیا گیا۔ اس نوعیت کی تنظیم معاشرہ کے لیے ایک تحریری معاہدہ استوار کیا گیا جس کی نوعیت درحقیقت ایک باقاعدہ تحریری دستور کی ہے۔ اس کو بجا طور پر دنیا کا پہلا تحریری دستور کہا جاتا ہے۔ ہم یہاں اس دستور کی دفعات پر بحث

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۱۴۶

نہیں کرنا چاہتے، البتہ اس کے چند اہم پہلوؤں کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں۔ اس دستوری معاہدے کے ذریعے نبیؐ اکرم نے جو کچھ حاصل کیا وہ یہ تھا۔

— مدینہ کے منظم ہونے والے معاشرے میں خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کو اساسی اہمیت حاصل ہو گئی۔

— سیاسی، قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیار (AUTHORITY) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آ گئی۔

— دفاعی لحاظ سے مدینہ اور اس کے نواح کی پوری آبادی ایک متحدہ طاقت بن گئی اور اس کے کسی عنصر کے لیے قریش کی حمایت کے دروازے بند ہو گئے۔ نیز دفاعی لحاظ سے بھی مرکزی اور فیصلہ کن اختیار آنحضور صلعم کے پاس آ گیا۔

اس دستوری معاہدہ سے باضابطہ طور پر اسلامی ریاست اور اسلامی نظامِ حیات کی تاسیس واقع ہو گئی[1]۔ اس زمانے کی حالات کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھیں تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ کتنے بڑے پیمانے کا کارنامہ تھا اور اس کے پس منظر میں ایک لامثال سیاسی بصیرت اور گفت و شنید کی مہارت کام کرتی ملتی ہے۔ یہ دستوری دستاویز بھی اور دوسرے معاہدات و معاملات اور جنگی منصوبے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ نبیؐ اکرم صرف ایک صوفی و درویش نہ تھے بلکہ اجتماعی معاملات کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لیے ماہرانہ حکمت سے آراستہ تھے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔

[1] ہر طاقت کوئی نصب العین لے کر اٹھتی ہے وہ ہمیشہ سب سے پہلے اسکی فکر کرتی ہے۔ جب کی جماعتِ اسلامیہ کی بے سروسامانی کو دیکھئے اور مدینہ کے اجنبی ماحول میں آکر چند اجڑے پچھڑے افراد کا عالم ابتلا دیکھیے اور پھر ملاحظہ فرمائیے کہ کیسے اولین اسلامی ریاست کی فوراً تاسیس کی جاتی ہے اور کیسے چند مہینوں میں دستور بن کر نافذ ہو جاتا ہے۔ نسلی اور مذہبی لحاظ سے گوناگوں متضاد عناصر کو اتنا جلد ایک دستور پر متحد کر دکھانا تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اس کے مقابلے میں آج پاکستان کا حال دیکھیے کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے۔ ہر طرح کے ذرائع و وسائل اور تنظیمیں موجود ہیں لیکن آٹھ برس دستوری ڈھانچہ بننے میں لگ گئے اور اس میں بھی نصب العین کا معاملہ اب تک جھگڑے کا موضوع بنا رہا۔

نظامِ مؤاخات | مدینہ کے معاشرہ کا ایک بڑا مسئلہ سینکڑوں مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ تھا۔ گھربار چھوڑ چھاڑ کر مسلسل لوگ اکٹھے چلے آرہے تھے اور چند ہزار کی آبادی رکھنے والی متوسط سی بستی کو انہیں اپنے اندر جذب کرنا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو جو تاریخ میں جب بھی پیدا ہوتا ہے، پریشان کن بن جایا کرتا ہے، مدینہ کے معاشرے اور اس کے صدر ریاست نے جس کمالِ حکمت سے حل کیا اس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کوئی آرڈی ننس جاری نہیں کیے گئے، کوئی قانون نہیں ٹھونسے گئے۔ الاٹ منٹیں نہیں کی گئیں۔ مہاجرین کی تعداد معین کر کے کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ کسی جبر سے کام نہیں لیا گیا محض ایک اخلاقی اپیل کے ذریعے اس پُرپیچ مسئلے کو چند روز میں حل کر لیا گیا۔ سرورِ عالم نے عقیدے اور نظریئے اور مقصد کی صحیح معنوں میں ایک نئی برادری پیدا کر دکھائی اور ایک ایک انصاری کے ساتھ ایک ایک مہاجر کا برادرانہ رشتہ قائم کر دیا۔ انصار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے مال، مساکن، باغات اور کھیت آدھوں آدھ بانٹ کر رفقائے مقصد کو دے رہے تھے، بلکہ بعض تو یہاں تک تیار ہو گئے کہ دو دو بیویوں سے ایک ایک کو طلاق دے کر اپنے دینی بھائیوں کے نکاح میں دے دیں دوسری طرف مہاجرین کی خودداری کا نقشہ یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں کھیت یا بازار کا راستہ دکھا دو، ہم تجارت یا مزدوری کر کے پیٹ پال لیں گے۔

مجرد، بالخصوص نوعمر مہاجرین جو اپنے آپ کو تعلیم کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے ان کی اقامت گاہ "صُفّہ" (مسجد نبوی کا ایک چبوترہ) تھی تعمیری کام کے سلسلے میں یہ ایک اہم ادارہ تھا۔ اصحابِ صفہ کی کفالت سوسائٹی کرتی تھی اور آنحضور صلعم خود ان کی ضروریات کی تکمیل میں سرگرم رہتے۔

پھر وہی کشمکش | یہاں تاریخ و سیرت کے پورے سلسلۂ واقعات کو پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ مجملاً ہم نے یہ دکھانا چاہا ہے کہ تحریک اسلامی کی پود مکہ سے آکر مدینہ میں کس طرح نصب ہوتی ہے اور کس طرح نئی کونپلیں نکالنے لگتی ہے۔ ماحول کیا تھا، اور اب ایک نئی موثر طاقت کے آجانے سے اس میں کس نہج پر نئی حرکات شروع ہو رہی تھیں۔ سوئے ہوئے معاشرے کو حریفِ حق نے آکر جگا دیا تھا۔ عمل کا ایک اسٹیج تیار ہو گیا تھا، اور اس پر ایک مثبت اور تعمیری طاقت اپنا کردار پیش کر رہی تھی۔ مثبت کردار کے سامنے آنے ہی تاریخی قانون کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی نہ کوئی منفی کردار بھی نمودار ہو۔ تعمیری مہم کے مقابل میں مثبت کا ضابطہ لازماً ایک

اسلام اور ہمارا قانونی نظام

عبدالقادر عودہ شہیدؒ

(۶)

مسلمان حکومتوں کا رویہ ہم اس سے پہلے وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ مسلمان ممالک کی حکومتیں کس طرح اسلام کے خلاف جنگ آزما ہیں اور کس طرح وہ اسلام کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو نشانۂ ستم بنا رہی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ حکومتیں کس طرح سے اللہ کے حرام کو حلال اور اللہ کے حلال کو حرام قرار دے رہی ہیں اسلامی قوانین کو معطل کر رہی ہیں اور حدود اللہ کو پامال کر رہی ہیں۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ان حکومتوں کی مساعی سامراجیوں کی حمایت اور جمہور مسلمین کی مخالفت کے لیے وقف ہیں۔ ہم اس سلسلے میں بے شمار مثالیں پیش کر چکے ہیں جن سے ان حکومتوں کے دعوائے اسلام کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان کی ساری دوڑ دھوپ اسلام کے مفاد کے منافی ہے۔ یہاں ان مباحث و امثال کو دہرانے کی

(بقیہ محسنِ انسانیت)

تخریبی طاقت کو حرکت میں لانا چاہتا تھا۔ حق اگر میدان میں آگیا ہو تو پھر ناگزیر تھا کہ باطل کے محاذ پر بھی گرما گرمی پیدا ہو جائے۔ عاشق جانباز اگر کوچۂ جاناں کی طرف اقدام کرے تو پھر رقیب رو سیاہ کی ضرورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مدینہ میں جس نئے معاشرہ کی اٹھان ہو رہی تھی اسے دیکھ دیکھ کر شیطان بُری طرح تلملا رہا تھا۔ وہ اپنے کچھ فدا کار لوہ نشان بڑھاد میدان میں لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسے آلہ بننے کا رول کتنے لوگ وہ ان کو اٹھا کر اسٹیج پر لے آیا۔ تحریک کو پہلے سابقہ ابراہیم علیہ السلام کے نام لیواؤں سے تھا، اب اس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حجۃ بنائے تقدس پہنے اور کتاب اللہ بغل میں لیے خراماں خراماں بڑھتے دکھائی دیئے۔ تحریک اسلامی کے ڈرامے میں پہلے جو پارٹ متولیانِ کعبہ نے ادا کیا تھا۔ اب مدینہ میں وہی پارٹ فرزندانِ بیت المقدس نے اپنے ذمے لیا۔ (باقی)

ضرورت نہیں ہے۔ لیکن مناسب ہوگا کہ یہاں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان حکومتوں کی اس روش کا باعث کیا ہے۔ اس روش کے دو بڑے وجوہ ہیں۔ ایک احکامِ اسلام سے ناواقفیت۔ دوسرے اقتدار کے چھن جانے کا خوف۔ یہ امر انتہائی افسوسناک اور اذیت بخش ہے کہ مسلمان ممالک کی عنانِ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام سے قطعی جاہل ہیں۔ وہی ہماری قوم کی گاڑی کے چلانے والے ہیں اور وہی بین الاقوامی مجالس و تقریبات میں اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی اور ترجمانی کرنے والے ہیں۔ ان میں سے بہت سے حکمران ایسے بھی ہیں جن کے آبا و اجداد گہرے اور پختہ اسلامی علم و عمل سے آراستہ تھے اور یہ لوگ آج بھی اپنی انفرادی زندگی میں متدین ہیں لیکن ان کا اسلام چند مراسم عبادات تک محدود ہے اور وہ ایک عامی مسلمان سے زائد کچھ بھی اسلام کا علم نہیں رکھتے۔ ان کے ذہن میں اسلام صرف صوم و صلوٰۃ اور حج کا نام ہے۔ وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں کہ اسلام دنیا و آخرت کے ہر مسئلے پر حاوی ہے اور وہ مسجد سے لے کر ایوانِ حکومت تک ہماری ہر قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ اصولِ اسلام میں سے اوّلین اصول یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی نازل کردہ ساری تعلیمات پر ایمان لائے اور ایمان فقط قول و اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ عمل بھی اس کا لازمی تقاضا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

لیس الایمان بالتمنّی ولکن ما وقر فی القلب وصدقہ العمل وان قوماً خرجوا من الدنیا ولا حسنۃ لھم وقالوا نحسن الظن باللہ وکذبوا، لو احسنوا الظن لاحسنوا العمل۔	ایمان کا انحصار تمناؤں پر نہیں ہے بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں جاگزیں ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے۔ کچھ لوگ دنیا سے اس حال میں اُٹھے کہ ان کے لیے کوئی بھلائی نہیں انہوں نے کہا کہ ہم اللہ سے نیک گمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ جھوٹے ہیں۔ اگر انہوں نے اچھا گمان رکھا ہوتا تو عمل بھی اچھے کرتے۔

ہر شخص سے عمل کے بارے میں سوال ہوگا۔ اگر اس نے اچھا عمل کیا ہے تو اس کے حق میں مفید ہوگا اور اگر برا کیا ہے تو اس کے حق میں مُضر ہوگا۔ قرآن میں ارشاد ہے:۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ	کہہ دو کہ عمل کرو پس عنقریب اللہ دیکھے گا تمہارے عمل کو اور

(التوبہ - ۱۰۵) اس کا رسول بھی۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الحجر - ۹۳)
پس تیرے رب کی قسم ہم پوچھیں گے ان سب سے اُن کے عمل کے بارے میں۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (الزخرف ۷۲)
اور یہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو اُس کے بدلے جو تم کرتے تھے۔

حکمرانوں کی جہالت ہمارے حکمرانوں کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ نے ہم پر اسلام کے قوانین کی پابندی فرض کی ہے اور ہمیں اس کی اجازت نہیں دی کہ ہم کسی اور نظاموں کی پیروی کریں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہماری حکومت کی اساس منزل من اللہ احکام پر قائم ہونی چاہیے۔ اور جو اللہ کی نازل کردہ تعلیم کے مطابق حکومت نہ کرے وہ فسق وکفر کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اطاعت اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرے۔ اللہ کے احکام میں تفریق نہیں کی جا سکتی اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے حکم کو پیروی کے لیے منتخب کرنے کی اجازت ہمیں نہیں دی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ۔ (البقرہ: ۸۵)
کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصے پر اور کفر کرتے ہو کچھ حصے کا پس کچھ نہیں جزا اس کی جو ایسا کرے تم میں سوائے دنیا کی زندگی کی ذلت کے اور قیامت کے دن وہ زیادہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ۔ (المائدہ: ۴۹)
اور بچ اُن سے مبادا وہ فتنے میں ڈال کر تجھے ہٹا لیں اللہ کی نازل کردہ تعلیم کے کچھ حصے سے۔

ان حکمرانوں کو اس امر کا مطلق احساس نہیں ہے کہ اقامت دین حکومت کا اوّلین فریضہ ہے اور دین میں عبادت، سیاست، معیشت اور اخلاق سب کچھ شامل ہے۔ اسلام کی دعوت کا قیام، اس کی اشاعت اور حدود اللہ کو قائم رکھنا حکومت کے واجبات میں سے ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو اپنے ہاں نافذ کرکے شرعوا لھم من الدین مالم یاذن بہ اللہ کے مصداق بن رہے ہیں یعنی وہ ایک

ایسا دین گھڑ رہے ہیں جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ وہ لوگوں کو تحاکم الی الطاغوت پر مجبور کر رہے ہیں اور اس طرح شیطان انہیں دور کی گمراہی میں مبتلا کر رہا ہے۔ ان کا حال اُن لوگوں کا سا ہے جن کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ۔ (النور: ۴۸)

اور جب انہیں بلایا جاتا ہے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے اُن کے درمیان، اُس وقت ان کا ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا۔ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا۔ (النساء: ۶۱-۶۳)

اور جب کہا جاتا ہے ان سے آؤ اللہ کی نازل کردہ چیز کی طرف اور رسول کی طرف تو دیکھتا ہے منافقین کو کنی کتراتے ہوئے۔ پس کیا حال ہوتا ہے جب انہیں مصیبت پہنچتی ہے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے پھر آتے ہیں تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہم تو صرف صلح صفائی چاہتے تھے۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ جانتا ہے پس اُن سے اعراض کر اور انہیں نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دل میں اترنے والی ہو۔

ان حکمرانوں کو معلوم ہے کہ یہ قوانین جدیدہ انسانی خواہشات ہیں اور سیاسی جماعتوں اور حکمرانوں کی تراوشِ افکار ہیں لیکن کیا انہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ نے ایسی خواہشات و افکار کی پیروی کرنے اور کرانے سے منع فرمایا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان قوانین نے اہلِ مغرب کو بامِ عروج تک پہنچا دیا ہے حالانکہ اس گمان میں ذرہ برابر حقیقت نہیں ہے۔ کیا جس وقت مسلمانوں نے یورپ والوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا تھا اور جس وقت صلیبیوں کو مار مار کر نکال دیا تھا، اور جس وقت یورپ کے اطراف میں مسلمانوں کا سکہ رواں تھا، کیا اُس وقت یورپ میں یہی قوانین رائج نہیں تھے۔ اگر دنیا کی بھیڑ مسلمان سے اختلاف رکھتی ہو یا اُس کی مخالف ہو تو مسلمان کو اس کی کیا پرواہ ہے۔ حق اتباعِ کثرت و اکثریت کا نام نہیں ہے۔ حق تو صرف خدا و رسول کے پیچھے

چلنے کا نام ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا (یونس: ۳۶) ان کی اکثریت نہیں پیروی کرتی مگر ظن کی۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانعام: ۱۱۶) اور اگر تو پیروی کرے اہل زمین کی اکثریت کی تو وہ تجھے بھٹکا دیں گے اللہ کی راہ سے۔

مومن تو امر اللہ کا پابند ہے۔ وہ سر مو اس راستے سے انحراف نہیں کر سکتا۔ وہ بالکل ہوا و ہوس کا بندہ نہیں ہے۔ اُسے لوگوں سے نہیں بلکہ اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمارے حکام یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ مسلمان اللہ کی نافرمانی کر کے ان کی فرمانبرداری کریں گے۔ کفر و طاغوت کی اطاعت تو اُن پر حرام کی گئی ہے اور اللہ و رسول کی پکار پر لبیک کہنا اُن پر واجب کیا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال: ۲۴) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو لبیک کہو اللہ اور رسول کو جب وہ تمہیں بلائیں اُس شے کی طرف جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (النور: ۵۱) مومنین کا قول تو یہ ہے کہ جب انہیں بلایا جائے اللہ اور اس کے رسول کی طرف کہ وہ ان کے مابین فیصلہ کریں تو وہ کہتے ہیں "سنا ہم نے اور مانا ہم نے"۔

یہ ہیں ہمارے فرمانروا اور یہ ہیں احکام اسلام! اگر وہ ان احکام سے جاہل ہیں تو اس جہالت کا نتیجہ مسلمانوں کی اور خود ان کی تباہی و ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور اگر وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں یا ان احکام کا صریح انکار کرتے ہیں تو انہوں نے اللہ کے عہد کو توڑ دیا ہے، انہوں نے اس شے کو توڑ دیا ہے جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا تھا، انہوں نے اللہ کی زمین میں فساد کا بیج بو دیا ہے، انہوں نے خدا کا بندہ ہونے اور اس کی عبودیت بجا لانے سے انکار کر دیا ہے، انہوں نے تخت حکومت پر بیٹھ کر اپنی خدائی اور کبریائی کا ڈنکا بجانے کی کوشش کی ہے۔ میں ان لوگوں کو خدا کا یہ پیغام سنائے بغیر نہیں رہ سکتا:

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اور جو لوگ توڑتے ہیں اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد

مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ۔ (الرعد ۲۵)

اور کاٹتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اللہ نے اور زمین میں فساد کرتے ہیں وہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے لعنت ہے اور بُرا ٹھکانا ہے۔

وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ... وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا۔ (النساء ۱۷۲، ۱۷۳)

اور جو اس کی بندگی کو عار سمجھے اور بڑا بن بیٹھے پس ان سب کو وہ اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔ . . . اور جو لوگ بندگی کو عار سمجھتے تھے اور بڑے بنتے تھے پس انہیں دردناک عذاب دیگا اور وہ اللہ کے سوا کوئی رفیق و مددگار نہ پائیں گے۔

حرصِ اقتدار یہ عجیب بات ہے کہ مسلمان ممالک کے ارباب حکومت پر اقتدار کی حرص اور اس کے چھن جانے کا خوف بُری طرح سے مسلط ہے۔ وہ اس اقتدار کا دائمی پٹہ اپنے نام لکھوانے کے لیے بےقرار رہتے ہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ اپنی عزت، اپنے وطن اور اپنے ابنائے وطن کی عزت کو اقتدار کی بھینٹ چڑھانے میں تامل نہیں کرتے۔ وہ اللہ اور اللہ کے دین کے دشمنوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے دین کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ وہ پورے اخلاص، آمادگیٔ نفس اور طمانیت قلب کے ساتھ اعدائے اسلام سے دوستی گانٹھتے ہیں۔ وہ یہ سارے پاپڑ محض اس لیے بیلتے ہیں کہ اقتدار کی کرسی اُن کے نیچے سے کھسکنے نہ پائے اور نہ اُن کی فرمانروائی کا سنگھاسن ڈولنے پائے۔ وہ انگریزوں، روسیوں، فرانسیسیوں اور امریکنوں کی اطاعت بجا لاتے ہیں اور بے گناہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی جان، مال اور آبرو سے کھیلتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کا فرمان ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ۔ (آل عمران: ۱۴۹، ۱۵۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لاتے ہو اگر تم اطاعت کرو گے ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا وہ پھیر دیں گے تمہیں اُلٹے پاؤں ایسا ہو جاؤ گے تم گھاٹا پانے والے۔ بلکہ اللہ تمہارا ساتھی ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ۔ (آل عمران: ۱۰۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا جو اہلِ کتاب میں سے ہے تو وہ بنا دینگے تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کافر۔

کیا ان حکمرانوں کو معلوم نہیں ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب آج بھی مسلمانوں کی ہوا خواہی کا دم محض اس لیے بھرتے ہیں تاکہ انہیں کفر کی طرف لوٹا دیں۔ یہ حکمران ان لوگوں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی ہرگز نہیں کرتے جو اسلام کے خادم ہیں، کیونکہ یہ حکمران مسلمان ریاستوں کو اللہ کے رنگ میں نہیں بلکہ غیر اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ وہ اس تہمت سے بچنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں ان کے بارے میں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ یہ اسلام کے حق میں متعصب ہیں اور کٹر مسلمان ہیں۔ بس اس ڈر کے مارے وہ اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں حالانکہ اسلام ہی اُن کے لیے اور ان کی قوم کے لیے طاقت و عزت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اگر وہ اسلام کی حقیقت پر غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اسلام سے محبت اور کفر سے بغض ہی تو ایک مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے مسلمان پر تو لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے گردوپیش کو اللہ کے رنگ میں رنگ دے۔ صبغة الله و من احسن من الله صبغة۔

افسوس کہ اسی ہوس اقتدار نے اقتدار کے بھوکوں کو ذلیل و رسوا کر رکھا ہے اور اسلام سے جہالت نے اسلام کا راستہ روک رکھا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسے ارباب حکومت سے پالا پڑ گیا ہے جن کا نصب العین احکام اسلام کا قیام و نفاذ نہیں بلکہ اپنے اقتدار کا بقا و قیام ہے۔

اَيُّهَا الْمُسْلِمُون!

اے مسلمانو! تمام بلاد اسلامیہ استعمار پرستوں کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ استعمار یہاں کی زمین و آسمان پر چھا گیا ہے۔ اس نے ہمارے ہاں لُوٹ مچا رکھی ہے۔ ہماری بوٹیاں نوچی جا رہی ہیں۔ ہمارا خون نچوڑا جا رہا ہے۔ ہمارے معتقدات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ہماری عزت و ناموس سے کھیلا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنے دین سے برگشتہ کیا جا رہا ہے۔

اے مسلمانو! تمہارے ہاں ایسے قوانین رائج ہیں جنہیں تمہارے دین اور تمہاری تہذیب سے کوئی نسبت

اور کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تمہارے شعور و عقیدہ کی کھلی کھلی توہین ہے۔ اس سے تمہارے درمیان فتنہ و فساد کی اشاعت ہو رہی ہے۔ یہ استعماری حربے ہیں جو تمہارے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے لوٹ کھسوٹ کو قانونی شکل عطا کی ہے اور کافرانہ حکومت کے لیے سند جواز مہیا کی ہے۔

اے مسلمانو! یہ تمہاری حکومتیں ہیں جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر رہی ہیں، قوانین اسلام کو معطل کر رہی ہیں، اسلام کے خادموں پر مظالم ڈھا رہی ہیں اور مغربی طاقتوں سے ساز باز کر رہی ہیں۔

اے مسلمانو! یہ تمہاری زندگی کا اجتماعی نظام ہے جس پر تمہارے قلوب مطمئن نہیں ہیں اور تمہاری طبائع راضی نہیں ہیں لیکن اس نظام کو تمہارے اوپر تمہاری حکومتیں استعماری طاقتوں کی مدد سے بجبر مسلط کر رہی ہیں۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس فاسد نظام کو منہدم کر دیا جائے اور اس کی جگہ پر اسلامی نظام برپا کیا جائے۔ جب تک سامراجیوں اور ہماری حکومتوں کی پیدا کردہ رکاوٹیں تمہاری راہ سے دور نہیں ہونگی، اسلام کی آمد اور پیش قدمی ہمیشہ مؤخر ہوتی رہے گی۔ آئیے ہم اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو اس مقصد کی خاطر قربان کریں اور اپنے مخالفین کا مقابلہ صف بستہ ہو کر کریں۔ ہمیں آخری اور فیصلہ کن معرکے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ فیصلے کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔

ولینصرن اللہ من ینصرہ . . . . . واللہ غالب علیٰ امرہ ولکن اکثر الناس لایعلمون۔

(نصرت بعون اللہ)

سابقہ ادارہ دارالاسلام پٹھانکوٹ

سابقہ ادارہ دارالاسلام پٹھانکوٹ کی تعمیرات متروکہ کا کلیم داخل کیا گیا ہے۔ اس کے ثبوت میں ان کا نقشہ پیش کرنے کی ضرورت ہے جو ادارے کے ماہواری رسالہ دارالاسلام کے پہلے نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اگر کسی صاحب کے پاس یہ نمبر موجود ہو تو براہ مہربانی عاریتہً عنایت فرمائیں۔ یہ رسالہ ۱۹۳۹ء میں جاری ہوا تھا۔

نیاز علی خاں۔ جوہر آباد ضلع سرگودھا۔

رسائل و مسائل

حیاتِ برزخ

سوال۔ تفہیم القرآن کا مطالعہ کر رہا ہوں، الحمدللہ بہت اچھے طریقے سے مضامین قرآن مجید ولنشیں ہو جاتے ہیں لیکن بعض مواقع پر کچھ اشکال محسوس ہوئے ہیں۔ ان کو پیش خدمت کیے دیتا ہوں، براہ کرم ان کا حل تجویز فرما کر مرحمت فرمائیں۔ یہ چند معروضات اس لیے ارسال کر رہا ہوں کہ میں نے آپ کی تصنیفات میں سے رسائل و مسائل حصہ اول و دوم اور تفہیمات حصہ اول و دوم کو بہ نظر غائر دیکھا ہے۔ ان میں آپ نے جن آیات اور احادیث پر قلم اٹھایا ہے ان کے مفاہیم کو دلائل سے واضح فرمایا ہے۔ بنا بریں میں امید کرتا ہوں کہ میرے پیش کیے ہوئے گزارشات کو بھی دلائل سے بیان فرما کر میری تشفی فرمائیں گے۔

(۱) سورۂ یونس کی آیت فکفیٰ باللہ شھیدًا بیننا وبینکم ان کنا عن عبادتکم لغٰفلین کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "یعنی وہ تمام فرشتے۔۔۔الخ اور وہ تمام جن اور ارواح اسلاف واجداد، انبیاءؑ اولیاء، شہداء وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھیرا کر وہ حقوق انہیں ادا کیے گئے جو دراصل خدا کے حقوق تھے وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت بجا لا رہے ہو۔ تمہاری کوئی دعا، کوئی التجا، کوئی پکار اور فریاد، کوئی نذر و نیاز، کوئی چڑھاوے کی چیز، کوئی تعریف و مدح اور ہمارے نام کی جاپ اور کوئی سجدہ ریزی و آستانہ بوسی و درگاہ گردی ہم تک نہیں پہنچی"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جتنے لوگ مر چکے ہیں، خواہ وہ انبیاء علیہم السلام ہوں یا اولیاء کرام ہوں، وغیرہ، ان کے مزاروں اور قبروں پر لوگ جا کر چیخیں چلائیں اور حاجات کے لیے پکاریں وہ اس سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں اور کچھ نہیں سنتے، اور اس مضمون پر بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں، مثلاً سورۂ نحل والقوا الیھم القول انکم لکاذبون میں بھی آپ نے تصریح فرمائی ہے۔ اور انک لاتسمع الموتیٰ۔ وما انت بمسمع من فی القبور، ان تدعوھم

لا یسمعوا دعاءکم - ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہ الی یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غافلون لیکن جب حدیث کی طرف نظر پڑتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مردے سنتے ہیں اور زیارت کرنے والے کو پہچان لیتے ہیں اور سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ذہن قلق و اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے اور کوئی صحیح مطلب برآری نہیں کر سکتا اور نہ کوئی صحیح تاویل سمجھ میں آتی ہے۔ لہٰذا اس مضمون کی چند حدیثیں پیش خدمت کرتا ہوں، براہ کرم ان حدیثوں کا مطلب بیان فرما کر عقدہ کشائی فرماویں۔

(۱) مقتولین بدر سے حضور علیہ السلام کا الیس قد وجدتم ما وعد کم ربکم حقاً فرمانا اور حضرت عمرؓ کا یہ کہنا "یا رسول اللہ! ما تکلم من اجساد لا ارواح لھا اور حضور کا ارشاد فرمانا ما انتم با سمع لما اقول منھم صاف دلالت کرتا ہے کہ مردے سنتے ہیں۔ اس حدیث کی تاویل جو حضرت عائشہؓ سے منقول ہے اس کی رُو سے حضرت عمرؓ کے سوال اور حضور کے جواب میں کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔

(۲) اخرج ابن عبد البر وقال عبد الحق اسنادہ صحیح عن ابن عباس مرفوعاً، ما من احد یمر بقبر اخیہ المؤمن کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الا عرفہ و رد علیہ۔

(۳) فی الصحیحین من قولہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان العبد اذا وضع فی قبرہ وتولی عنہ اصحابہ انہ لیسمع قرع نعالھم

دوسری چیز جو قابلِ توضیح ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ نحل کی اس آیت وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ من دون اللہ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون اموات غیر احیاء وما یشعرون ایان یبعثون کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے کہ یہاں جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی جا رہی ہے وہ فرشتے یا جن یا شیاطین یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں بلکہ اصحاب قبور ہیں اور کچھ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ یدعون من دون اللہ سے مراد انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں۔ الخ۔

اب عرض یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے شہداء کو موتی کہنے کی نہی فرمائی ہے۔ ارشاد موجود ہے:۔
لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ، اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ

نے شہدا کو اموات غیر احیاء کیوں کہا؟ بظاہر آپ کی تشریح کے لحاظ سے ان دونوں آیتوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔

"اموات غیر احیاء" کے عموم میں آپ نے انبیاء علیہم السلام کو بھی داخل کیا ہے حالانکہ بہت سی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبروں میں جسد عنصری کے ساتھ زندہ ہیں، وہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، سلام سنتے اور اس کا جواب بھی دیتے ہیں (۱) الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون (۲) مررت بموسیٰ وھو قائم یصلی فی قبرہ (۳) من صلّیٰ علی عند قبری سمعتہ ومن صلّی علیّ نائیا ابلغتہ۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ بعد از وفات حضور کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور جنازہ میں کلام فرمایا کہ: یبرا ایلیں وصاپہ ابیس سوف تعلمون۔ اور قبر میں کلام فرمایا جس کو بعض اصحاب نے سنا۔ یہ تو وفات کے بعد فوری بات تھی کہ روح نے جسم کو کلیۃً نہیں چھوڑا تھا لیکن بعد میں تا حشر بھی روح کا وہی تعلق بدن سے قائم رہے گا۔ نیز بزرگوں کے اقوال کو چھوڑ دیئے۔ مذکورہ بالا تین حدیثیں آپ کی تفسیر کے خلاف پڑتی ہیں، براہ کرم ان کی تشریح کیجیے۔

جواب:- آپ نے جس اشکال کا ذکر کیا ہے وہ بظاہر تو بہت پیچیدہ معلوم ہوتا ہے لیکن تھوڑا سا غور کرنے پر ساری پیچیدگی رفع ہو جاتی ہے۔ موت کے متعلق یہ بات تو عقل عام اور مشاہدے سے معلوم و معروف ہے کہ وہ جسم اور روح کے درمیان اس تعلق کے انقطاع کا نام ہے جو عرف عام میں زندگی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس معنی میں عام انسانوں کی طرح انبیاء، اولیاء اور شہداء سب نے وفات پائی ہے۔ اور خود شریعت بھی ان کو دفن کرنے کی اجازت دیتی ہے، ان کا ترکہ تقسیم کرتی ہے (یا انبیاء کے معاملہ میں تقسیم ترکہ کو منع کرتی ہے) ان کی بیواؤں کے نکاح ثانی کو جائز رکھتی ہے (یا انبیاء کی حد تک اس کو حرام کرتی ہے نہ اس بنا پر کہ ان کے شوہر زندہ ہیں بلکہ اس بنا پر کہ ان کی حیثیت امت کے لیے بمنزلہ مادر ہے)، اور ان کے لیے موت، یا قتل، یا وفات کے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ اب لامحالہ جو زندگی ان کے لیے ثابت ہے وہ زندگی کے معروف معنی سے مختلف ہے۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر جب آپ قرآن اور حدیث کے بیانات پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس زندگی سے مراد بہر حال برزخی زندگی ہی ہے خواہ اس کے مدارج ہر ایک گروہ

کے لیے کتنے ہی الگ ہوں، اور وہ موت جس کا ان کے حق میں انکار کیا گیا ہے وہ موت بمعنی فنا اور عدم ہے نہ کہ موت بمعنی معروف۔

اس برزخی زندگی کی نوعیت، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا، ہر ایک گروہ کے حق میں الگ ہے۔ ایک زندگی کفار و فجار کی ہے، مگر وہ حوالاتیوں کی سی زندگی ہے جس میں ان کے لیے عذاب ہی عذاب ہے، انعام و اکرام کا کوئی پہلو اس میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی سنواتا ہے مگر کوئی خوشخبری نہیں بلکہ اس طرح کی باتیں جیسی کہ مقتولینِ بدر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنوائیں تاکہ ان کے الم میں اور اضافہ ہو۔ ان میں سے اگر کچھ لوگ دنیا میں پوجے جاتے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی سماعت کا کوئی موقع ان کو نہیں دیتا تاکہ اس سے وہ کوئی راحت نہ پا سکیں۔ بخلاف اس کے انبیاء اور اولیاء اور شہداء و صالحین کی زندگی عالی قدر مہمانوں کی سی زندگی ہے جو فیصلۂ آخرت سے پہلے ہی میزبانی کے نعائم سے سرفراز ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے لیے راحت اور لطف کے سامان فراہم کر رہا ہے اور تکلیف دینے والی ہر چیز سے ان کو محفوظ رکھ رہا ہے۔ انہیں جو کچھ سننے کا موقع دیا جاتا ہے وہ اہلِ دنیا کے سلام و درود ہیں، نہ کہ وہ مشرکانہ باتیں جو جہلاء اُن کے بارے میں کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان کو رنج ہی پہنچانے والی ہونگی نہ کہ خوش کرنے والی۔

اس تشریح کے بعد مجھے امید ہے کہ آپ کو آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے درمیان کوئی تعارض محسوس نہ ہو گا۔ دونوں جگہ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف پہلو بیان ہوئے ہیں، مگر چونکہ ان کی درمیانی کڑی کہیں تصریحات میں مذکور نہیں ہے اس لیے بظاہر ان میں تعارض نظر آتا ہے۔ تمام بیانات کو جمع کر کے بغور پڑھا جائے تو درمیانی کڑی انہی کے بین السطور سے مل جاتی ہے اور ظاہری تعارض رفع ہو جاتا ہے۔

"ترجیحی حصص"

سوال۔ بندہ کالونی ٹیکسٹائل مل کا حصہ دار ہے۔ ہر سال منافعہ کی رقم وہی آتی رہی ہے جو پہلے سال آئی تھی۔ اس وجہ سے میں نے مل مذکور کے دفتر سے معلوم کیا کہ کیا وجہ ہے کہ منافع ایک ہی رقم پر موقوف ہے۔ جواب ملا "آپ کے ترجیحی حصص" ہیں۔ ترجیحی حصص پر خسارہ کا کوئی امکان نہیں۔ ان پر ہمیشہ ایک ہی مقررہ

منافع ملتا رہے گا۔ میرے خیال میں یہ منافع سُود ہے۔ براہِ نوازش اپنی رائے سے مطلع فرماویں تاکہ سُود ہونے کی صورت میں حصص فروخت کر کے جان چھڑاؤں۔

جواب۔ اس نوعیت کے حصے بلاشبہ سُود کی تعریف میں آتے ہیں۔ آپ یا توان حصوں کو فروخت کر دیں یا ان کو اُس نوعیت کے حصّوں میں تبدیل کرالیں جن میں مقررہ منافع کے بجائے متناسب منافع ملتا ہے۔

سورۂ عنکبوت کی دو آیتیں

سوال۔ سورۂ عنکبوت میں دو آیتیں ایسی ملیں کہ جن کے معنی میری سمجھ میں نہیں آئے۔ میرے پاس جو قرآن پاک کی تفسیر ہے اُس میں بھی اُن کی وضاحت نہیں ملی، لہٰذا آپ کی دینی بصیرت سے اُمید قوی ہے کہ اب اُن کی تفصیل سے آگاہ فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں گے

(۱) سورۂ عنکبوت آیت ۵۰ میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ؕ	اور کہتے ہیں (منکر) کہ کیوں نہ اُتریں اُس پر کوئی نشانیاں اُس کے رب سے۔ (آپ) کہہ دیجیے کہ نشانیاں تو ہیں اختیار میں اللہ کے اور میں تو بس سُنا دینے والا ہوں کھول کر۔

مندرجہ بالا قرآنی آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزات اللہ تعالیٰ نے عطا نہیں فرمائے۔ معجزات حضورؐ کو عطا نہ کرنے کی جو وجوہات قرآن پاک میں درج ہیں وہ اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ مگر کیا اس سے حضور رسالت مآب کی شانِ مبارک میں فرق نہیں آتا کہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو نشانیاں اور معجزات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے کہ جن کی شہادت قرآنِ پاک خود دے رہا ہے۔ اور حضور علیہ السلام کو اس سے بالکل جواب دے دیا۔

سیرتِ نبویہ میں حضورؐ کے بہت سے معجزات درج ہیں۔ مثلاً معجزۂ شق القمر۔ تھوڑے سے تھوڑے کھانے سے جماعتِ کثیر کا سیر ہو جانا۔ کنکریوں کا کلمۂ شہادت پڑھنا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب بظاہر

قرآنی شہادت کی بنا پر غلط معلوم ہو رہے ہیں۔

(۲) سورۂ عنکبوت آیت ۲۷ میں یوں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا	اور دیا ہم نے ابراہیم کو اسحٰق و یعقوب اور رکھی اُس
فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ ۔۔۔ الخ	کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب۔

یہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بالکل چھوڑ دیا۔ حالانکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اس لیے سب سے پہلے اُن کا نام ہی آنا چاہیے تھا کہ جن کی نسل مبارک میں آگے چل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز ہوئے۔

جواب۔ (۱) قرآن مجید میں یہ بات متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے کہ کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزے کا مطالبہ کرتے تھے اور اس مطالبے کا جواب بھی قرآن میں کئی جگہ دیا گیا ہے ان سب مقامات پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے سوا کوئی معجزہ دلیلِ نبوت کے طور پر نہیں دیا گیا۔ یہ مطلق معجزے کی نفی نہیں ہے بلکہ ایسے معجزے کی نفی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے نبوت کی علامت اور دلیل کی حیثیت سے پیش کیا ہو، اور جسے دیکھ لینے کے بعد انکار کرنے سے عذاب لازم آتا ہو۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوبؑ کے عطا کیے جانے کا ذکر بھی قرآن میں کئی جگہ آیا ہے مثلاً سورۂ انعام آیت ۸۵، سورۂ مریم آیت ۵۰، اور سورۂ انبیاء آیت ۷۲۔ ان سب مقامات پر حضرت اسمٰعیلؑ کا ذکر نہ ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ مواقع غیر معمولی انعام کی شان بیان کرنے کے ہیں اور یہ شان اولادِ ابراہیمی کی اُس شاخ میں پائی جاتی تھی جو حضرت اسحاق سے چلی۔ حضرت اسمٰعیل سے جو شاخ چلی اس نے ڈھائی ہزار سال بدویت کی زندگی میں گزار دیئے۔ اس کے اندر کوئی قابلِ ذکر شخصیت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک پیدا نہ ہوئی۔ بخلاف اس کے حضرت اسحٰقؑ سے جو شاخ چلی اس میں بکثرت انبیاء پیدا ہوئے اور اس کے بڑے کارنامے تاریخ میں موجود تھے۔

مطبوعات

الحسین | مؤلفہ جناب ابوالنصر۔ مترجمہ: شیخ محمد احمد پانی پتی۔ شائع کردہ: مکتبہ جدید، انارکلی، لاہور۔ قیمت مجلد معہ گردپوش ۸/ روپے۔

حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما، واقعۂ کربلا، اور اس واقعہ کا وسیع پس منظر ہماری تاریخ کے اہم موضوعات میں سے ہیں۔ پھر چونکہ ان موضوعات کے بارے میں جمہور اہل سنت، شیعہ حضرات اور خارجی گروہ کے درمیان شدید اختلافات ہیں، ہر کسی نے تاریخ کی تعبیر اپنے انداز سے کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے تاریخ کے یہ ابواب اہمیت کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی پیچیدگی بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

اس فتنوں بھرے دور تاریخ کا ریکارڈ ایک طرف تو جمہور مسلمین کے خلاف شیعہ و خوارج کے صف آرا ہو جانے کی وجہ سے بے شمار غلط فہمیوں اور مبالغہ آرائیوں سے بھرا پڑا ہے اور دوسری طرف اس میں کام کرنے والی شخصیتیں ایسی عظمت مآب ہیں کہ حقائق کا تجزیہ کرنے میں مورخ اور سوانح نگار بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ یہی صورت کارنامۂ حسینؓ کے مورخین کو پیش آتی رہی ہے۔

اس موضوع پر زیر نظر کتاب بظاہر بڑے محققانہ عزائم کے ساتھ لکھی گئی ہے، لیکن ان عزائم کے باوجود مثبت پہلو سے کوئی بڑی ندرتِ فکر سامنے نہیں آئی اور نہ واقعات کا مطالعہ و تجزیہ کسی مختلف اسلوب سے کیا گیا ہے۔ تاہم یہ کتاب ایک گونہ علمی مرتبہ رکھتی ہے اور تیسرے درجے کے مضمون نگارانہ انداز کی چیز نہیں ہے۔

اس کے اولین اوراق کو پڑھنے سے آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت دادہ مسلم سوسائٹی میں خلافت کے مسئلے کو اس طرح لیا گیا تھا جیسے کسی متوفی کی جائداد کے استحقاق کا مسئلہ موجب نزاع بنا ہوا ہو اور جاہ طلبوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے سے کشمکش کر رہے ہوں جیسے نظام امارت و حکومت کے بارے میں کتاب و سنت نے سرے سے کوئی رہنمائی نہ دی ہو اور کسی اصولی ہدایت کا سروسامان نہ کیا ہو۔ سقیفہ بنو ساعدہ کے اجتماع کی جن بحثوں کو عام کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی غیر معمولی حثیت کا حامل قرار

دیا گیا ہے، وہ درحقیقت دنیا کی کسی پارلیمنٹ اور شوریٰ کی اس موضوع پر ہونے والی معمولی بحثوں سے مختلف نہیں ہیں، اور اس مجلس کی برتری اور اس کے شرکاء کی صاف دلی کا روشن ثبوت یہ ہے کہ ذرا سے وقفے میں معاملہ سلجھ جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ مسئلہ "متفقہ طور پر" حل نہ ہو سکا۔ حالانکہ کسی اقلیت (بلکہ دو چار افراد) کے اختلاف کے باوجود جمہوری و شورائی نظام میں زعماء کی عظیم اکثریت جس فیصلے پر جمع ہو جاتی ہے اسے انسانی زبان میں ہمیشہ متفقہ فیصلہ کہا جاتا ہے۔ مؤلف کی نگاہ میں حضرت علی اپنے رفیقِ مسلک حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کو برحق ماننے پر اپنے آپ کو کبھی تیار نہ کر سکے۔ مگر تاریخ کا کوئی محقق اس بات کو قبول نہیں کر سکتا۔ حضرت علیؓ کا اختلاف عارضی تھا اور بعد میں آپ نے اپنا فراخدلانہ تعاون امیر المؤمنین کے سامنے پیش کر دیا۔ تاہم مؤلف ذاتی طور پر خلافت کے نظریۂ شورائی ہی کے قائل ہیں، جیسا کہ صفحہ ۱۵ کے پہلے پیراگراف سے واضح ہے۔

مؤلف کی اس رائے سے ہم اتفاق کرتے ہیں کہ شخصی بادشاہت کا دور شروع ہو جانے کے بعد حکمرانوں کو "خلیفہ" کا نام دینا اس اصطلاح کا نہایت غلط استعمال ہے۔ اور ہم اس سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ جناب معاویہ ہی کے ہاتھوں شخصی بادشاہت کا دروازہ کھلا ہے، چاہے ان کی نیت کتنی نیک ہو اور چاہے ان کے اقدام کو اجتہادی غلطی قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں مؤلف نے یہ دکھایا ہے کہ حضرت علیؓ کا ذہن صدقِ صد دینی تھا اور ان کے مقابلے میں امیر معاویہ کا اندازِ فکر سیاسی تھا۔ یہ تقابل بہت قابلِ غور ہے۔ امیر معاویہ جو دورِ خلافت اور دورِ ملوکیت کی درمیانی کڑی ہیں اور بہت سے وجوہ سے مسلمانوں کی نگاہ میں قدر و قیمت بھی رکھتے ہیں، مؤلف نے ان کا مؤرخانہ احتساب کرتے ہوئے بعد کے مصائب کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے۔ (ص ۵۰-۵۵)

امام حسینؓ کی سرگزشت جس طرح بیان کی گئی ہے، فی الجملہ وہ مطابقِ واقعہ ہے۔ سلسلۂ واقعات کا یہ پہلو بہت ہی قابلِ غور ہے کہ آپ جب کوفہ کے ارادے سے نکلتے ہیں تو آپ کے تمام محب اور خیر خواہ آپ کو باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان سب کے مشوروں کے جواب میں امام حسین کی طرف سے جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی سیاسی استدلال پر مبنی نہیں اور نہ حالات کے جائزے کی روشنی میں رویہ تجویز کرنے کا اندازِ فکر ان باتوں میں ملتا ہے۔ بلکہ جیسے ایک وجدانی جذبہ ہے جس میں سرشار ہو کر آپ مشہد کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں، جیسے تقدیرِ الٰہی آپ کے قافلے کی عناں بردار ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو فدا ہوں

کے طرزِ عمل کو دیکھ کر حالات کو اپنے ہاتھوں بدل ڈالنے سے مایوس ہو کر اس فیصلے پر پہنچ گئے تھے کہ اب سوئی ہوئی امت کو جھنجھوڑ دینے کے لیے تنہا اپنی جان کی بازی وقت کے فتنہ کے خلاف لگا دینی چاہیے اور اپنے خون کے قطروں کے بیج تاریخ میں ڈال دینے چاہئیں جو ابد میں برگ و بار لاسکیں اور جن کے ذریعے اس امت میں حق کی حفاظت اور باطل کی مزاحمت کے جذبات زندہ رہ سکیں۔ اس فیصلے کے پس منظر میں آپ کا جو اصولی نقطۂ نظر کام کر رہا تھا وہ کوفہ والوں کے نام ایک خط میں آپ نے پیش کر دیا یعنی " امام (صدرِ حکومت) وہ ہونا چاہیے جو کتاب اللہ پر پوری طرح عمل کرنے والا ہو، عادل ہو، اور دینِ حق کا فرماں بردار ہو" معاملہ ذاتی یا خاندانی اقتدار کا نہ تھا کہ رسول اللہ کی گدی آپ کے بال بچوں کو میراث میں ملنی چاہیے۔ ساری بازی اسی اصول کے لیے لگائی گئی۔

آپ آگے بڑھتے ہیں، ساتھی جو آ آ کر ساتھ ہو گئے تھے آہستہ آہستہ چھٹتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شہادت گاہ میں آپہنچتے ہیں۔ پہنچنے سے لے کر شہادت کی آخری ساعت تک جو گفتگوئیں آپ نے مخالفین سے کی ہیں اور جو تقریریں فرمائی ہیں ان کے ایک ایک بول سے پتھر بھی پانی ہو کر بہہ سکتا ہے، مگر وہ جانے کیسے انسان اور کیسے مسلمان تھے جن کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی بلکہ بے رحمی سے لڑے، نہایت بزدلانہ طریق سے عورتوں اور بچوں پر ظلم ڈھائے، پانی بند کرنے کی ذلیل کارروائی کی، اور پھر درندوں کی طرح امت کے عظیم ترین نوجوان پر جھپٹ پڑے، حد یہ کہ اسکی لاش کو گھوڑوں کے سموں سے روندا —— اور یہ سلوک اہلِ اسلام نے کبھی بدترین کفار کے ساتھ بھی روا نہ رکھا تھا۔ یہ حالات پڑھ کر آدمی کا سر چکرا جاتا ہے کہ حکومت جب معاشرے کو بگاڑنے پر تل جاتی ہے تو آناً فاناً بگاڑ کہاں تک جا پہنچتا ہے۔ کوئی نہ تھا جسے وقتی اشتعال ہی آجاتا، کوئی نہ تھا جو ہمہ تن احتجاج بن کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ ڈر اور لالچ، دو عوامل نے اکابر و عوام سب کو حکومت کا بے بس آلۂ کار بنا دیا تھا۔ دوسری طرف اس گرداب بلا میں آئے ہوئے امام اور ان کے ساتھیوں نے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثالیں نایاب ہیں۔ تاریخ نگاروں نے بعض مصالح کے تحت قتلِ حسین کی ذمہ داری کا تمام تر بوجھ یزید کے بجائے ابن زیاد اور شمر کے سر ڈالا ہے۔ اس کتاب میں بھی یہی نقطۂ نظر بطور روایت دہرایا گیا ہے۔ لیکن حکمران ان تمام واقعات و حوادث کا ذمہ دار ہے جو اس کے نمائندوں کے ذریعے اس کی حدودِ سلطنت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور پھر یزید کے ذہن و اخلاق کو سامنے رکھیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کا دفاع کیا جائے۔ محض یہ بات یزید کو سندِ تقدس نہیں دے دیتی

کہ اس کو ایک صحابی نے نامزد کیا ہے ۔ یزید پر قتلِ حسین کی پوری پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

اس داستانِ درد کا ایک اہم رُخ ہے جو واعظوں اور مقرروں اور ذاکروں اور شاعروں نے بالکل اوجھل کر دیا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ امام حسین نے آخر دم تک اس بات کی سعی کی کہ مسلمانوں کے اندر ان کی وجہ سے جنگ و جدال نہ ہونے پائے ۔ چنانچہ تین صورتیں آپ نے ابن زیاد کے سامنے رکھیں : ایک یہ کہ جہاں سے آپ آئے ہیں وہیں لوٹ جائیں ، دوسرے یہ کہ کسی سرحدی علاقے کی طرف چلے جائیں ، تیسرے یہ کہ آپ کو یزید کے پاس لے جایا جائے اور بالمشافہ اپنا معاملہ طے کریں ۔ لیکن ابن زیاد اور شمر نے ان تینوں صورتوں کو مسترد کر کے اپنی قسمت میں لکھے ہوئے سنگدلانہ اقدام کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ گویا امام حسین کی طرف سے حجت ہر طرح پوری ہو گئی ۔

مؤلف نے تاریخ کے اس خونیں باب کے مطالعہ کے ذریعے قارئین کو جس نتیجہ تک پہنچانا چاہا ہے وہ عجیب ابہام اپنے اندر رکھتا ہے ۔ استنتاج کی فصل کا عنوان ہے " وحدتِ اسلامی کی اپیل " ۔ اس فصل میں اگرچہ " اعلائے کلمۃ الحق " اور " اسلام کے جھنڈے کو سربلند رکھنے " کی کوشش کے الفاظ بھی ملتے ہیں لیکن مغزِ کلام یہ ہے کہ امام حسین مسلمانوں کو تفرقہ و اختلاف سے بچانے کے لیے اُٹھے تھے ۔ کیونکہ یزید کی حکومت پر مسلمانوں کا جمع ہونا ممکن نہ تھا اور آپ کی ذات سب کا مرجعِ اعتماد بن سکتی تھی ۔ چنانچہ کتاب کا مقصد آخری سطر میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ " مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی سچی تڑپ پیدا ہو جائے " ۔ ہم صاف صاف عرض کریں گے کہ شہادتِ حسین کا اصل سبق یہ ہرگز نہیں ہے ۔ وہاں سے تو ایک سبق یہ ملتا ہے کہ مسلمان گروہ کو کبھی بھی کسی غیر اسلامی یا فاسد نظامِ حکومت کے تحت مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ رہنا چاہیے ، بلکہ اس کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے ، دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ اگر حالات کی اصلاح کے لیے منظم تحریک کو آگے بڑھانے میں عوام کی بے حسی مانع دکھائی دے تو جیدار شخصیتوں کو اپنی جان کی بازی لگا کر اس خوابیدہ حس کو جھنجھوڑ کر جگانا چاہیے ۔ اور تیسرا سبق یہ ملتا ہے کہ با اصول اور خود دار آدمیوں کو سچائی پر قدم جمائے ہوئے ہر قسم کے ظلم و تشدد کو ہمت و شجاعت سے برداشت کرنا چاہیے ۔ افسوس ہے کہ کتاب ان اصل اسباق کو سامنے نہ لا سکی ۔

اس تنقید سے مقصود کتاب کی تنقیص نہیں ہے ۔ فی الجملہ یہ کتاب خاصی محنت سے لکھی گئی ہے ۔ زبان بھی مناسب ہے ، اور خوبصورت ٹائپ میں اچھے کاغذ پر چھپی ہے ۔ ترجمہ بھی اچھا معلوم ہوتا ۔

کاروانِ حجاز | از قلم جناب ماہر القادری، مدیر ماہنامہ فاران (کراچی)۔ شائع کردہ: مکتبۂ فاران، کراچی۔ قیمت مجلد مع گرد پوش عہ ۔

اللہ کی راہ میں جہاد اور ہجرت کے ساتھ ساتھ حج کا سفر دوسری ساری جادہ پیمائیوں پر فضیلت رکھتا ہے اس میں ایک گونہ مجاہدہ بھی ہے اور یہ ایک نہج سے شانِ ہجرت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے سفر کا سفرنامہ اگر کسی صاحبِ دل نے لکھا ہو تو یقیناً اس سے ایمان، عقل اور جذبات کو نئی زندگی ملتی ہے۔ کاروانِ حجاز ایک ایسی ہی رودادِ سفر ہے جس میں ماہر القادری نے اپنے تاثرات و مشاہدات پیش کیے ہیں۔ کتاب کی سطر سطر گواہی دیتی ہے کہ دین کا جذباتی عنصر جس سے ساری گرما گرمی رہتی ہے، ماہر کے ہاں فراواں ہے۔ یہ عنصر اگر حدود کو پھاندنے لگے تو اس سے زیادہ خطرناک کوئی اور چیز نظامِ دین میں نہیں ہو سکتی، لیکن ماہر کا جنون بھی اتنا ہوشیار ضرور ہے کہ ایمان کی سرحدوں سے کہیں تجاوز نہیں کرتا۔ ایک طرف توحید کے تقاضے ملحوظ ہیں، دوسری طرف محبتِ رسول سنتِ رسول کی پابند؛ جہاں کوئی نازک مقام آتا ہے، ماہر القادری فوراً محتاط ہو جاتے ہیں۔

سفرنامہ میں بہت سی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کا بیان ہے۔ ازاں جملہ ایک مقام پر سید محمد طلحہ کا تذکرہ ملتا ہے جو سید احمد شہید کے خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ موصوف ایک تحقیقی تصنیف میں معروف ہیں جس کا عنوان "الحیات فی قرون الاول" ہے۔ اس کتاب میں دورِ صحابہ کی زندگی کا پورا نقشہ سامنے لانا پیشِ نظر ہے۔ گفتگو میں آپ نے بیان فرمایا کہ ایک قدیم عربی کتاب میں ان کھیلوں کا تذکرہ ملا ہے جو دورِ صحابہ کے بچوں میں رائج تھے۔ اگر یہ کتاب تکمیل پا کر سامنے آئی تو ہمارے لٹریچر میں گراں بہا اضافہ ہوگا۔

سرزمینِ عرب میں جانے والے قادیانیوں کے بارے میں تو اجمالاً اچھی خاصی تحقیق شاملِ کتاب ہے۔ پاک و ہند کے کچھ تاجر پہلے پہل عرب میں داخل ہوئے اور جدہ میں انہوں نے اپنے مادی کاروبار کے ساتھ ساتھ مذہبی کاروبار بھی شروع کر دیا۔ روپیہ پیسہ دے کر لوگوں کے ایمان خریدنے کے درپے ہوئے۔ آخر بات کھل گئی اور پولیس نے ان کے ہاں سے وہ رجسٹر بھی برآمد کر لیے جن میں ان کے متاثرین کی فہرستیں درج تھیں اور جن کو تنخواہیں اور وظائف دیئے جاتے تھے۔ یہ لوگ وہاں "فتنی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ حکومت نے ان کے شر کی اب پوری طرح روک تھام کر دی ہے۔

ایک اہم مذکور اس کتاب میں پاکستانی سفارت خانے کے متعلق ملتا ہے۔ ماہر صاحب بتاتے ہیں کہ ہندوستانی سفارت خانے کے قونصل جنرل مسٹر قدوائی ہندوستانی حاجیوں کی خبرگیری کے لیے دن رات حجاج میں چکر لگاتے رہتے ہیں، لیکن پاکستانی سفارت کا ہر شخص بادشاہِ بے خبر بنا ہوا ہے۔ پاکستان سے حکومت نے جو طبی مشن بھیجا اس کے انچارج ڈاکٹر کو شکایت رہی کہ سفارت خانہ نے مشن کو حاجیوں کی خدمت کا پورا موقع ہی نہیں دیا۔ پاکستانی سکّے کی گرتی ہوئی قیمت کا بھی اپنے تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر مؤلف نے ماتم کیا ہے۔ حد یہ کہ لوگ پاکستانی نوٹ کی صورت سے بھاگتے تھے۔ جب کسی ملک کے حکمران اور رہنما تعمیر و ترقی میں لگنے کے بجائے مفاد و منصب کے کھیل میں لگ جاتے ہیں تو نتیجہ یہی نکلتا ہے۔

کتاب میں تجربات اور اسباق بھرے ہیں، جا بجا اپنی تاریخ کے مختلف گوشوں پر بحثیں ہیں، بہت سے مسائل فقہی کا تذکرہ ہے، آخر میں "گذارش اور مشورے" کے زیر عنوان حج کی ترغیب دلانے اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے لیے بڑی مؤثر سطور نگاہ سے گزرتی ہیں۔ خاتمہ حمد و نعت کے اشعار پر ہوتا ہے

یہ سفرنامہ دینی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے اردو تحریروں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے

امامیہ مشن کا لٹریچر | از قلم: سید العلما سید علی نقی النقوی، مجتہد العصر۔ ملنے کا پتہ: سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ، اردو بازار۔ لاہور۔

حسب ذیل رسائل برائے تبصرہ موصول ہیں: (۱) خدا کا ثبوت (۲) حسین اور اسلام (۳) شجاعت کے مثالی کارنامے (۴) قاتلانِ حسین کا مذہب (۵) محاربۂ کربلا (۶) اسیریٔ اہل حرم۔ علی الترتیب قیمتیں ۲ ن، ۳ ن، ۴ ن، ۸ ن، ۵ ن اور ۳ ن ہیں۔

یہ رسائل ہمارے شیعہ بھائیوں کے مکتب فکر کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان میں اگرچہ مناظرانہ ڈگر کو چھوڑ کر کسی قدر نیا اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن مسائل اور بحثیں وہی ہیں جن پر صدیوں سے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ مگر ان جھگڑوں سے کسی کی بگڑی نہ بن سکی۔ ہم اس لٹریچر کے مباحث پر کوئی گفتگو کرنے کے بجائے صرف اتنا کہیں گے کہ اس میں انسانیت کے نام کوئی ایسا پیغام نہیں ہے جو اس کو زندگی کے عملی خارزار میں سے بہ سلامت نکال لے جائے۔ اس میں کوئی نظریۂ سیاسی نہیں ملتا، اس میں موجودہ معاشی

گتھیوں کو سلجھانے کا سر و سامان نہیں ہے، اس میں قوموں کو باہمی تصادم سے بچا لینے

کی کوئی سبیل نہیں بیان کی گئی ہے۔ اس میں الحاد کی بنیادوں پر قائم ہونے والی تہذیب جدید کے طوفانی حملے کا کوئی توڑ سامنے نہیں لایا گیا، اس میں قدیم اور جدید جاہلیتوں کا شکار ہوتی ہوئی عورت کو کوئی راہ نجات نہیں بتائی گئی، اس میں سرمایہ داری اور کمیونزم سے ٹکر لینے والا کوئی نظریہ نہیں دیا گیا، اس میں کوئی فلسفۂ تاریخ نہیں ملتا، اس میں کوئی نظامِ اخلاق نمایاں نہیں ہوتا ___ الغرض اس میں سرے سے دورِ حاضر کے اجتماعی انسان کو مخاطب ہی نہیں کیا گیا۔ بس مسلمانوں کے اندر کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کے خلاف اپنی شکایات بیان کی ہیں، اپنا مقدمہ پیش کیا ہے، اپنی طرف سے الزامات لگائے ہیں، اور اپنے آپ کو ایک علیحدہ جتھا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ مقدمہ صحیح ہے یا غلط، گذشتہ کئی صدیوں سے یہ اسی طرح پیش ہوتا رہا ہے، اس پر بحثیں ہوئی ہیں، مناظرے ہوئے ہیں، سر پھٹول ہوئی ہے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ کسی فریق کی کونسی بگڑی اس کے ذریعے سنور گئی ہے۔ اور آج ہم پوچھتے ہیں کہ پوری دنیا کو چھوڑیئے، پاکستان کا کونسا بھلا اس میں ہے۔ خدا کے لیے شیعہ سنی جھمیلے سے ذرا بالاتر ہو کر پوری آبادی کو دیکھ کر اس کے اخلاق، اس کے اعمال، اس کے کیریکٹر، اس کے لین دین، اس کے آمد و صرف، اس کی خانگی اور کاروباری زندگی، اس کی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کا جائزہ لیجیے کہ کس درجہ کی تباہی سے آپ دوچار ہیں ___ پنج تن کے معتقدین کی اخلاقی سطح کیا ہے اور خلفائے اربعہ کے محبوں کا معیارِ تقویٰ کہاں تک پہنچتا ہے۔ جائزہ لیجیے اور پھر خدا کے لیے اس پستی سے خود نکلنے اور دوسروں کو نکالنے کی جدوجہد کیجیے۔ آپ دوسروں کے خلاف بحثیں اٹھانے کے بجائے اپنے گروہ کی زندگی کو بنائیں اور دوسرے آپ کے خلاف مناظرے کرنے کے بجائے اپنی فکری و اخلاقی تعمیر کریں۔ ورنہ الحاد کی عالمگیر طاقت کے سیلاب کے سامنے نہ آپ رہیں گے، نہ دوسرے!

اگر آپ کے نزدیک سچا دین و مذہب آپ کے حلقے میں محفوظ ہے تو پھر اس پریشان حال دنیا کے سامنے آپ اس نظامِ زندگی کی تصویر پیش کیجیے جس کے آپ امانت دار ہیں اور بتائیے کہ آپ کا دین و مذہب وقت کے مسائل کو کیسے حل کرتا ہے۔ محض یزید کو گالیاں دینے اور امام حسین کا ماتم کرنے سے تو انسانی زندگی بن سنور نہیں سکتی۔

NEW ERA. | بادارت: خورشید احمد و ظفر اسحٰق انصاری۔ مقام اشاعت: آرام باغ روڈ، کراچی۔ چندہ سالانہ دس روپے، فی پرچہ ۴ر۔

پریس اور صحافت اجتماعی زندگی پر اثرانداز ہونے والی بہت بڑی طاقت ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ طاقت شخصی اور گروہی مفاد و اغراض کی آلۂ کار بن کر بے اصولے پن کے روگ میں مبتلا ہے۔ خصوصیت سے انگریزی صحافت تو ہمہ تن ایک خاص طبقے کی ترجمان ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک بہت بڑی مسلمان سلطنت کے عوام کے رجحانات کی ترجمانی کا کوئی اطمینان بخش ذریعہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ انگریزی پریس میں احیائے اسلام کی اس تند و تیز رَو کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی جو جمہور کے فکری سمندر میں مدت سے چل رہی ہے۔

ایسے حالات میں ایک مختلف نوعیت کے انگریزی اخبار کا خلاء شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ غالباً اسی خلاء کو پُر کرنے کے لیے ہفتہ وار "نیو ایرا" جلوہ گر ہوا ہے۔ ضرورت اگرچہ روزنامے کی ہے، لیکن آغازِ کار اگر ہفت روزہ جریدے سے بھی ہوا ہے تو یہ بہرحال امید افزا ہے۔ اس اخبار کی ادارت دو ذہین اور حساس نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے جن کے علم و مطالعہ اور جن کی ترقی کرتی ہوئی صلاحیتوں سے ایک بہت ہی اچھے مستقبل کی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ یہ دونوں نوجوان مسلم طرزِ فکر کے حامل ہیں اور ان کے جذبوں میں جان اور اندازِ تحریر میں ندرت موجود ہے۔

"نیو ایرا" کا نام بڑا معنی خیز ہے۔ یہ درحقیقت اس تاریخی حقیقت کا مظہر ہے کہ دنیائے اسلام کی نئی نسل ایک دورِ نَو کی تخلیق کے درپے ہے۔ نیو ایرا اسی صبحِ فردا کی اذان ہے۔ اگرچہ معنوی سنجیدگی کے تقاضے سے اخبار کو صوری لحاظ سے جامۂ سادگی پہنایا گیا ہے تاہم کاغذ، ٹائپ، عنوان بندی اور ترتیب میں خاصا ذوقِ جمال کام کر رہا ہے۔ دو تین شماروں میں جو مضامین، بحثیں، تفریحی اجزا، معلوماتی تصاویر، اداریے اور نوٹ سامنے آئے ہیں وہ مغز کے لحاظ سے معلومات افزا، فکر کے لحاظ سے اصول پسندانہ اور زبان کے لحاظ سے ادب افروز ہیں۔ یہ بہت اچھا ہے کہ نیو ایرا گروہی تعصب کے بندھنوں سے آزاد ہو کر فرض کی راہوں پر گامزن ہوا ہے اور بجا طور پر اسے ہر پاکستانی اپنا اخبار سمجھ سکتا ہے۔ توقع ہے کہ پاکستان کے دورِ تعمیر میں یہ اہم پارٹ ادا کر سکے گا۔ ہم بڑی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

خالی صفحه

مخلوط انتخاب کے انتشار انگیز نعروں

نے پاکستان کی جد و جہد میں اپنی جان ' مال اور آبرو کی قربانی دینے والے لاکھوں مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا مسلمانوں کا تہذیب و تمدن دوسری تہذیبوں سے کوئی جداگانہ نوعیت نہیں رکھتا اور کیا پاکستان کے حصول کے لئے ساری قربانیاں بیکار نہیں تھیں ۔ اگر مسلمانوں کے تصور زندگی اور غیر مسلموں کے تصور زندگی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور پاکستان میں بھی اسلام کو اجتماعی نظام کی حیثیت سے اس لئے اختیار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر مسلم اسے پسند نہیں کرتے ۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے نہایت تفصیل کے ساتھ اسلامی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے تمیز کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلامی تہذیب کے ماخذ دنیا کی دوسری تمام تہذیبوں سے قطعاً مختلف ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن کو اس وقت تک صحیح معنوں میں نہ قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ اختیار ہی کیا جا سکتا ہے جب تک کہ ان بنیادوں کو تسلیم نہ کیا جائے جن پر اسلامی تہذیب کی عمارت استوار کی گئی ہے ۔ دیدہ زیب گرد پوش اور مضبوط جلد قیمت تین روپے آٹھ آنے ۔

تاریخ کا کوئی دور ہو

پتھر کا زمانہ ہو یا ایٹم کا دور

اســلام

ہر دور میں ایک نہایت کامیاب اجتماعی نظام کی حیثیت سے چل سکتا ہے کیونکہ اس کے اصول انسانی فطرت کی بنیاد پر قائم ہیں اور الہامی ہدایت کی روشنی سے منور ہیں

تنقیدات

میں مولانا امین احسن اصلاحی نے مختلف علمی ' سیاسی ' معاشی اور معاشرتی مسائل کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں اتنی خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ حل کیا ہے کہ نہ صرف مختلف گتھیاں سلجھ گئی ہیں بلکہ اسلام کی انقلاب انگیز دعوت بھی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی ہے ۔ خوبصورت گرد پوش اور مضبوط جلد ۔ قیمت ساڑھے تین روپے ۔

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور میں چھپا